Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.78, 2010, pp 61 - 120

مجلۂ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، جنوری۔مارچ ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۸

نسیم حجازی کی تحریروں میں طنز و مزاح

ڈاکٹر شفیق احمد (محمد اشرف گل)

Abstract:

NASEEM HIJAZI is generally recognized as a historical novelist who can write nothing other than emotional stories of Islamic history. But now it has been prooved *(through a research thesis by Dr. Tasadduq Hussain Raja, a research thesis by Dr. Ghulam Muhammad Butt , and a research thesis by Dr. Mumtaz Umar)* that his novels are not merely the stories of Islamic horoes but also a valuable record of history of some important parts and events of world. The theme of this article is that NASEEM HIJAZI is much more than a mere novelist. He also writes wit which is up to the mark in all aspects. There are a few people who know that his four books are appreciable for irony and humour. Other than these books, a reasonable touch of wit is found in any kind of his writings i.e Novels, Editorials, and Safar Nama etc. In short, he bears a natural sense of Irony and humour.

نسیم حجازی کی تحریروں میں طنز ومزاح کا ایک خاص انداز ملتا ہے۔ان کی باقاعدہ مزاحیہ تصانیف کے علاوہ عمومی وصحافتی تحریریں بھی ظرافت کی حامل ہیں۔نسیم حجازی کی طنز ومزاح پر مشتمل کتب الگ سے بھی موجود ہیں لیکن یہ بات بھی اہم ہے کہ ان کا مزاحیہ اسلوب ان کی ہر تحریر مثلاً اخباری اداریوں اور مضامین، سفرنامہ اور ناولوں وغیرہ میں بھی اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔

☆ پروفیسر شعبۂ اردو و اقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

اگر ہم نسیم حجازی کی تمام تحریروں کا بغائر مطالعہ کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تحروں میں طنز و مزاح کے تقریباً سبھی حربوں کو استعمال کیا ہے لیکن تکرار سے بچنے کے لیے ہم ان کی تحریروں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نسیم حجازی کے سفرنامہ اور صحافتی تحریروں میں طنز و مزاح

نسیم حجازی کا سفر نامہ 'پاکستان سے دیارِ حرم تک' جذبات سے معمور ہونے کے با وجود شگفتہ اسلوب کا خوب صورت نمونہ ہے۔ مثلاً جب وہ اس سفر پر روانگی سے قبل کراچی میں ویزا اور فارن ایکسچینج کے ٹنٹے نمٹا رہے تھے تو وقت کی قلت کے احساس کو یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''میری گھڑی عام طور پر پیچھے رہا کرتی ہے لیکن آج اس کی سوئیاں بڑی تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔'' (۱)

اسے مزاح کہا جاسکتا ہے نہ طنز، بہر حال اس میں ظرافت کا لطیف احساس واضح ہے۔

نسیم حجازی کے اخباری اداریوں اور مضامین میں طنز کی آنچ تیز اور مزاح کی کیفیت بہت کم ہے۔ ان کے اداریوں میں مستقل چبھن موجود ہے جو بسا اوقات نشتر کا احساس پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ ''۱۹۴۷ء کی کرپان اور ۱۹۷۰ء کی تلوار'' کے زیرِ عنوان اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ پکے کمیونسٹ جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی تھی اور وہ نیشلسٹ جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے خلاف اکھنڈ بھارت کے حامیوں کا ساتھ دیا تھا اور وہ مفاد پرست جنہوں نے صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا، اب مسٹر بھٹو کے آمرانہ عزائم کا ساتھ دے کر قوم کے احتساب سے بچنا چاہتے ہیں۔'' (۲)

وہ ایک اور اداریے میں اسکندر مرزا کے بادشاہ بننے کے ارادے اور اس کے شرکائے

اقتدار کے طرزِ عمل پر یوں طنز کرتے ہیں:

''وزراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کی زبان پر انتخابات کے بے فائدہ ہونے کی حکایت تھی۔ عوام میں یہ خبر گشت کرتی رہتی تھی کہ عنقریب ملک میں صدر سکندر مرزا اپنی بادشاہت کا اعلان کردیں گے اور وہ ہماری عظمتِ رفتہ کو اس طمطراق سے واپس لے آئیں گے جس طرح محمد شاہ رنگیلا کے زمانہ میں بادشاہت کی شان و شوکت موجود تھی۔ ہزارہ سے تعلق رکھنے والے چھوٹے وزیر نے تو نہ صرف سکندر مرزا کو شہنشاہ کہنا شروع کردیا تھا بلکہ خود کو بھی مشرق و مغرب کا بادشاہ تصور فرما لیا تھا۔'' (۳)

ذرا آگے چل کر بادشاہت کا خواب دیکھنے والے اسکندر مرزا کے طرزِ عمل کو احمقانہ قرار دیتے ہوئے اس حقیقت سے پردہ ہٹاتے ہیں کہ

انہوں نے ایک غیر ملکی کمپنی کو تاج سازی کے لیے آرڈر بھی دے دیا تھا:

''ناہید سکندر مرزا کے حسین چہرے اور سکندر مرزا کے سیاسی سر کے لیے تاج کی تیاری کا آرڈر غیر ملکی فرم کو دے دیا گیا تھا اور پاکستان سے ان تاجوں کے لیے خالص سونا بھجوا دیا گیا تھا۔'' (۴)

اس اقتباس میں ''حسین چہرے'' اور ''سیاسی سر'' کمال کی طنزیہ تراکیب ہیں۔ پاکستانی سیاست کے اس سیاہ دور میں حق گوئی اور جابر حاکم کے متعلق بے باکی کا یہ انداز نسیم حجازی کا حصہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بہت سے اداریوں کے ناموں میں بھی تیز کاٹ ہے جیسے 'ماضی کے رہزنوں کو مستقبل کے امین نہ بنایئے'، 'ماضی کے کھوٹے سکے' اور 'قومی زبان اور انگریزی زدہ ذہن' وغیرہ۔ نسیم حجازی کی صحافتی تحریروں میں کہیں کہیں فکاہیہ کالم بھی ملتے ہیں۔ ان میں عام طور پر سیاسی امور و افراد پر کڑی طنز ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال نسیم حجازی کا اداریہ 'نٹ کے تماشے' ہے جس کے بارے میں شہرین فاروقی یوں رائے دیتی ہیں:

''کوہستان کی اشاعت یکم جولائی ۱۹۵۷ء میں اسکے کالم ''نشیب و فراز'' میں ''کوہ پیما'' کے قلمی نام سے ایک خبر جو کہ مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی وزارت سازی کے لیے اپنی اکثریت کے دعووں پر مشتمل تھی اور مسلم لیگ کے ممتاز دولتانہ اور ری پبلکن کے ڈاکٹر خان صاحب کے بیانات پر مشتمل تھی(۵)۔کوہستان نے ان دونوں لیڈروں کے بیانات کو ہدفِ تنقید بنایا اور مزاحیہ انداز میں ان لیڈروں کو ''نٹ'' کے تماشے سے تشبیہ دی۔''(۶)

اسی طرح ''جشنِ مری'' کے حوالے سے سکندر مرزا اور ایوب خاں کو ''بابر و اکبر'' قرار دیتے ہوئے زبردست طنز کی گئی ہے۔شہرین فاروقی نے اداریہ نویس کی یہ عبارت رقم کی ہے:

''اخبارات میں ''جشنِ مری'' کے منتظمین کے جو اشتہارات شائع ہو رہے ہیں ان میں اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ تقاریبِ رنگا رنگ پر مشتمل یہ جشن کس خوشی میں منعقد ہو رہا ہے؟ کیا کشمیر فتح ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بابر و اکبر نے بارِعیش کھولنے کے لیے مری کا انتخاب کیا ہے؟''(۷)

اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ نسیم حجازی کا قلم طنزیہ مزاج رکھتا تھا۔ وہ اپنے سامنے آنے والی ہر خرابی کو ہدفِ تنقید بناتا تھا۔ اپنی رائے کو نپے تلے انداز میں پیش کرنا اور اس میں استہزاء میں ڈوبی ہوئی تنقید سمونا نسیم حجازی کا طرۂ امتیاز ہے۔

نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں میں طنز و مزاح

نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں تاریخی واقعات اور کرداروں کے ساتھ ساتھ شگفتہ واقعات اور کردار بھی شامل کیے ہیں۔مزاح کی یہ آنچ کہیں ہلکی ہے اور کہیں تیز لیکن ان کا کوئی بھی ناول طنز سے خالی نہیں ہے۔مثال کے طور پر 'آخری چٹان' کا ہیرو طاہر بن یوسف مدینہ سے بغداد کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اس کا وفادار نوکر زید بھی اس کا شریکِ سفر ہے۔ یہ کردار ''حاجی بغلول'' یا ''احمق الدین'' تو نہیں البتہ سلجھا ہوا مزاحیہ کردار ضرور ہے۔اس کی احمقانہ

حرکتوں سے ابتذال نہیں بلکہ سلیقہ مند مزاح پیدا ہوتا ہے۔ یہ مزاح اس وقت عروج پر جا پہنچتا ہے جب وہ طاہر کی اجازت کے بغیر بغداد میں ایک مناظرہ دیکھنے جاتا ہے۔ اختتام پر لوگ گتھم گتھا ہوجاتے ہیں اور زید بھی مار پٹائی کی زد میں آجاتا ہے۔ وہ سوجی ہوئی ناک اور رخساروں کے ساتھ چپکے سے مکان میں داخل ہوکر سونے کی کوشش کرتا ہے لیکن طاہر کو پتا چل جاتا ہے۔ نسیم حجازی اس موقعے پر ہونے والی گفتگو کو یوں تحریر کرتا ہے:

''زید تھوڑی دیر اپنے بستر پر بیٹھ کر اٹھا اور دیوار کے ساتھ لٹکتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی صورت دیکھنے کے بعد بولا۔

''دوست! اب میں بھی تمہیں مشکل سے پہچان سکتا ہوں۔ اچھا تماشا دیکھنے گئے تھے تم!'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنا گال سہلاتا ہوا پھر بستر پر آبیٹھا۔

''زید! تم آگئے!'' طاہر نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ زید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی اس نے اپنے چہرے سے چادر اٹھا کر اس کی صورت نہیں دیکھی، فوراً اٹھ کر شمع بجھا دی اور اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں میں آگیا ہوں!''

''بہت دیر لگائی تم نے! کیا سیکھا وہاں؟''

''گالیاں!'' زید نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

''تمہاری آواز بہت مغموم ہے۔ خیر تو ہے؟''

زید نے ایک اداس ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

طاہر نے کہا۔ ''تمہاری آواز سے معلوم تا ہے کہ تمہاری ناک میں تکلیف ہے!''

زید نے بستر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تاک سے زیادہ میری آنکھ میں تکلیف ہے!''

طاہر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ (۸)

یہ کردار پورے ناول میں سیدھی لکیر کی طرح چلتا جاتا ہے اور جا بجا ناول کے بوجھل پن کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔

نسیم حجازی کے تاریخی ناول 'شاہین' میں بھی طنز کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک بشیر بن حسن کی بدر بن مغیرہ کے ساتھ وہ گفتگو ہے جس میں وہ بدر کی شخصیت کے متعلق غرناطہ کے شعراء کی مبالغہ آرائی کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس موقعے پر نسیم حجازی لکھتے ہیں:

بدر نے کہا۔''یہ شاعر کی زبان ہے۔''

بشیر نے جواب دیا۔''خدا کا شکر ہے کہ میں شاعر نہیں۔ میں نے الزغل کے دسترخوان پر غرناطہ کے چند شعراء سے ملاقات کی ہے۔ وہ تمہاری تعریف میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''کیا کہتے تھے میرے متعلق وہ؟''

''بس یہی کہ تم ہوا میں اڑ سکتے ہو، پانی پر چل سکتے ہو، تمہیں دیکھ کر سمندر کی طوفانی لہروں میں سکون آ جاتا ہے اور دریا.....''

''دریا کیا.....؟''

''مجھے یاد نہیں رہا، شاید وہ یہ کہتے تھے کہ دریا پہاڑوں کی طرف واپس ہو جاتے ہیں۔''

بدر نے کہا۔''احمق کہیں کے۔'' (۹)

مزاح کے حوالے سے نسیم حجازی کا ناول 'خاک اور خون' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ اس ناول میں اسماعیل، چودھری رمضان، خیر دین کمہار اور لچھمن سنگھ کے کردار مزاحیہ ہیں۔ان میں اسماعیل کا کردار چودھرانہ ہے جو لوگوں کی کمزوریوں سے واقف ہے لیکن وہ اپنی اس واقفیت کو بلیک میلنگ کے لیے نہیں بلکہ کسی چوپال یا عوامی اکٹھ میں لوگوں کو محظوظ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ایک جگہ وہ اپنے گاؤں میں آنے والے پیر ولایت شاہ کی فربہی پر چوٹ

کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جٹوں نے پیر صاحب کو پھل اور مٹھائیاں کھلا کر موٹا کر دیا ہے۔ آج ان کے گھوڑے کی کمر دوہری ہو رہی تھی۔ ابھی خدا کے فضل سے یہ جوان ہیں لیکن خدا کے حضور پہنچتے پہنچتے ان کا وزن ڈیڑھ دو من اور زیادہ ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ پل صراط سے کیسے گزریں گے۔ ان کا بوجھ اٹھانے کے لیے تو مال گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔'' (۱۰)

اسی طرح ایک موقعے پر سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان متوقع لڑائی ٹل جاتی ہے لیکن اسماعیل اس کے باوجود چودھری رمضان کو خوف زدہ کر کے اس انداز میں بھگاتا ہے کہ سننے والوں کے قہقہے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ نسیم حجازی اس موقعے پر لوگوں کے مچھلی پکڑنے اور اسے ایک کسی ایک شخص کو دینے کا منظر یوں پیش کرتے ہیں:

اسماعیل نے کہا۔ ''دیکھو بھئی! اگر تم میں سے کوئی یہ بتا دے کہ اس وقت چودھری رمضان کہاں ہے تو مچھلی اس کی۔''

اب چودھری رمضان کی کسی کو خبر نہ تھی۔ لوگوں نے اس کے متعلق مختلف اندازے لگائے لیکن اسماعیل نے سب کے دعوے رد کر دیے۔

بالآخر لچھمن سنگھ نے کہا۔ ''دیکھو اسماعیل! ہمیں پتہ ہے کہ تم یہ مچھلی نہیں چھوڑو گے۔ اچھا بتاؤ کہاں ہے چودھری رمضان؟''

اسماعیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جب ہم لڑنے کے لیے تیار تھے تو وہ ادھر سرکنڈوں میں چھپ گیا تھا۔ جب اندر سنگھ نے شیر سنگھ کو لاٹھی ماری تھی تو اس نے یہ سمجھا کہ لڑائی شروع ہوگئی ہے اور وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اس گنے کے کھیت میں پہنچا اور پھر ہماری مکئی کے کھیت سے گزر کر لال سنگھ کے گنے کے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا لیکن

اتنی دیر میں اباجی بند بندھوانے کے لیے گاؤں سے باقی آدمی لے کر آرہے تھے۔ اس نے اس کا شور سن کر یہ خیال کیا کہ وہ اس کی تلاش میں آرہے ہیں۔ وہ الٹے پاؤں بھاگا اور گنے کے کھیتوں میں چھپتا ہوا چچا علی محمد کے جوار کے کھیت میں جا چھپا۔

اتنی دیر میں گاؤں کے دوسرے آدمی مدد کے لیے آرہے تھے، چودھری رمضان نے جوار کا کھیت بھی اپنے لیے محفوظ نہ سمجھا، وہ وہاں سے بھاگ کر گنے کے کھیتوں میں آگیا۔ اب اسے یہ پتا نہ تھا کہ وہ کس طرف جارہا ہے۔ پانی کی کھائی میں چلتا ہوا وہ پھر اس طرف آنکلا، تم بند باندھ رہے تھے لیکن اس نے یہ سمجھا کہ تم لڑائی میں مارے جانے والوں کی لاشیں دبا رہے ہو۔ وہ الٹے پاؤں لوٹا اور اب وہ ہمارے گنے کے کھیت میں بیٹھا ہوا ہے!'' (۱۱)

یہی چودھری رمضان پسرور سے اپنے گاؤں کی عورتوں کی فرمائش پر ان کے لیے ہانڈیاں لاتے ہوئے کرایے کے معاملے میں ریلوے کے بابو سے جھگڑتا ہے تو بھی قہقہے بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اسی ناول کا خیر دین کمہار بھی اگرچہ باقاعدہ مزاحیہ کردار نہیں لیکن حسبِ ضرورت قہقہہ آور افعال کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کے کے علاوہ لچھمن سنگھ اور کاکو عیسائی ایسی جوڑی ہے جو ہمہ وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں اور اسی کوشش میں اکثر و بیشتر خندہ خیز حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔

''پردیسی درخت'' کا ماسٹر جگن ناتھ بھی کرداری مزاح کے حوالے سے نسیم حجازی کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ ایک دن وہ لڑکوں کو سزا دیتے ہیں لیکن جب بہادر سنگھ کی باری آتی ہے تو نہایت مزاحیہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے:

''بہادر سنگھ کی باری آئی تو ماسٹر جگن ناتھ نے غصے کی حالت میں بید بلند کیا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ بید ڈیسک پر لگا اور اس کے ساتھ ہی

سر کی جنبش کے باعث ماسٹر جگن ناتھ کے بال ماتھے پر بکھر گئے۔ ماسٹر جی نے بید والے ہاتھ سے اپنے سر کے بکھرے ہوئے بال ٹھیک کیے اور دوبارہ زیادہ زور سے بید مانے کی کوشش کی لیکن بہادر سنگھ نے پہلے سے زیادہ پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور ماسٹر جی آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کی تیسری کوشش یہ تھی کہ بہادر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے اوپر رکھ لیا اور بید مارنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اب تم نے ہاتھ پیچھے کیا تو چمڑی ادھیڑ دوں گا لیکن بہادر سنگھ اس مرتبہ بھی ہاتھ پیچھے کرنے سے نہ رہ سکا۔ بید پھر ڈیسک پر لگا اور ساری کلاس ہنس پڑی۔ ماسٹر جگن ناتھ نے ہانپتے کانپتے اپنے بال ٹھیک کیے پھر مضبوطی سے بہادر سنگھ کے دائیں ہاتھ کی کلائی اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑلی اور ایڑیاں اٹھا کر پوری قوت سے بید مارا۔ بہادر سنگھ نے عین وقت پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بید ماسٹر صاحب کی کلائی پر لگا اور انہوں نے درد سے کراہتے ہوئے ''تیرا بیڑا غرق'' کہہ کر اپنی کلائی پکڑلی۔'' (۱۲)

نسیم حجازی کے اس ناول میں واقعاتی مزاح بھی ہے۔ اس کی بہترین مثال بچھمن سنگھ کے بھینسے کا چودھری رمضان کے کوٹھے کی چھت پر چڑھ جانے کا منظر ہے جو اپنے وزن کی وجہ سے کڑیاں توڑ کر اندر لٹک جاتا ہے۔ نسیم حجازی نے یہ منظر یوں پیش کیا ہے:

''بچھمن سنگھ کی کوشش ہوتی تھی کہ اس (پیال کے) ڈھیر کی سطح رمضان کے کوٹھے سے نیچے نہ ہونے پائے۔ جس دن رمضان نے کوٹھے پر گندم ڈالی تھی، بچھمن سنگھ نے اپنی بکریاں باندھ لی تھیں لیکن اس کا بھینسا کسی طرح کھل گیا اور خدا معلوم اسے کیا سوجھی کہ وہ پیال کے ڈھیر پر سے گزرتا ہوا چودھری رمضان کے کوٹھے پر جا پہنچا۔ چودھری رمضان اندر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا کہ اوپر

کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی۔ مٹی گری اور اس کے ساتھ ہی چھت سے یکے بعد دیگرے دو سیاہ ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ بھینسے کی ٹانگیں۔ میاں بیوی سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باہر سے جلال اور اس کی بہن نے دہائی مچادی۔ ''ماں! ماں! بچھمن سنگھ کا بھینسا کوٹھے پر چڑھ گیا۔'' رمضان کسی بہت خطرناک جن کا تصور کر رہا تھا۔ وہ ہانپتا، کانپتا اور لرزتا ہوا باہر نکلا۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد وہ لکڑی کی سیڑھی سے اوپر چڑھا۔ بچھمن سنگھ کے بھینسے کی گردن چھت کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس کی اگلی دو ٹانگیں نیچے دھنس گئی تھیں۔ پچھلی ٹانگیں ابھی تک پیال کے ڈھیر پر تھیں۔ بے کسی اور انکساری کا یہ پیکرِ مجسم اپنی خاموش نگاہوں سے چھت کی ناپائیداری کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔'' (۱۳)

یہاں پہنچ کر قاری ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح وہ واقعہ بھی بہت مزاحیہ ہے جس میں سلیم کا گھوڑا پیر ولایت شاہ کے سینے کے لٹکتے ہوئے گوشت کو پکڑ لیتا ہے اور وہ لوگوں کو مدد کے لیے پکارتا ہے:

''پیر جی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکے۔ سلیم کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ گھوڑے نے ان کے فربہ سینے کا فالتو گوشت جو چلتے وقت اوپر نیچے اچھلا کرتا تھا، اپنے دانتوں کی گرفت میں لے لیا۔ ولایت شاہ کی کیفیت اس ہاتھی سے مختلف نہ تھی جس کی سونڈ شیر کے منہ میں آچکی ہو۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخ رہے تھے۔'' (۱۴)

اسی طرح وہ منظر واقعاتی مزاح کی ایک بہترین مثال ہے جس میں بڈھن شاہ اور اس کا مرید غلام نبی ڈومنے سے بچاؤ کے لیے جوہڑ میں پناہ لیتے ہیں لیکن مکھیاں اس سے پہلے ہی اپنا بیشتر کام مکمل کر چکی ہیں۔ مکھیوں کے جانے کے بعد پیر اور مرید جوہڑ سے نکل کر یوں

گفتگو کرتے ہیں:

چند ثانیے بعد بڈھن شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور فکر مند ہو کر بولا۔
''چودھری جی! وہ پھر تو نہیں آجائے گا؟''
غلام نبی کا برا حال ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کالا بھوت آ بھی جائے تو آپ کی شکل اتنی بدل چکی ہے کہ وہ آپ کو نہیں پہچان سکے گا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ہاں بچے بھی آپ کو دیکھ کر بھاگ جائیں گے اور ابھی تو آپ کے چہرے پر سوجن آنی شروع ہوئی ہے اور سائیں جی آپ اپنے مرید کی طرف دیکھ رہے ہیں! آپ کو ڈر نہیں آتا اس سے؟'' (۱۵)

نسیم حجازی کی سنجیدہ تحریریں بھی شگفتگی سے خالی نہیں ہوتیں۔ ان کے ناول 'پردیسی درخت' کا ہیرو یوسف اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے جب وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گنے کے کھیتوں میں سے گزر رہا تھا کہ یکا یک ایک خوف ناک درندہ دکھائی دیا۔ اس نے اپنے بھائی کو دوڑایا اور تھوڑی دیر بعد اس سے آملا۔ پھر رک گیا اور تھوڑے فاصلے پر پھر جا ملا۔ اس موقعے پر ایک پروفیسر صاحب اور یوسف (ہیرو) کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو اپنے اندر گدگدی کا احساس لیے ہوئے ہے:

پروفیسر نے پوچھا۔ ''آپ رک کیوں جاتے تھے جناب؟''
''پروفیسر صاحب! درندے سے زیادہ مجھ پر اس بات کا خوف سوار تھا کہ اگر درندے نے حملہ کر دیا تو میرا بھائی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔'' (۱۶)

اسی طرح جب نسرین چچا کا گلہ کرتی ہے کہ وہ اسے چڑیا گھر کی سیر نہیں کرا سکے اور ہمیشہ امتحانات میں مصروف رہنے کا بہانہ کرتے ہیں تو اس کی نانی شگفتہ سا جواب دیتی ہیں:

''بیٹی! اپنی تعلیم ختم کر کے جب وہ لاہور واپس آئے گا تو میں اسے کہوں گی کہ وہ تمہیں جی بھر کر چڑیا گھر کی سیر کرائے اور اس بات کی کوشش

کرے کہ چڑیا گھر والے تمہارے لیے وہاں ایک خوب صورت سا پنجرہ بنوا دیں۔'' (۱۷)

فہمیدہ کے چچا ڈاکٹر جمیل لندن میں اپنے کلاس فیلو ڈاکٹر کمال الدین کے لیے فہمیدہ کا رشتہ تجویز کرتا ہے لیکن سب خاندان والے اس کے خلاف ہیں۔ اس کی تصاویر دیکھ کر نسرین اپنی روایتی تیزی سے کام لیتے ہوئے اسے ''چونچ'' کا لقب دیتی ہے۔ ایک موقعے پر یوسف کے پوچھنے پر وہ اس کا حلیہ یوں بیان کرتی ہے:

''اس کی ایک آنکھ ذرا اوپر اور ایک ذرا نیچے ہے۔ ناک لمبوتری ہے۔ بالکل لنگور کی طرح۔ گردن لمبی اور صراحی دار ہے، ایسی جیسی اونٹ کی ہوتی ہے۔'' (۱۸)

اسی طرح جب قدسیہ، بلقیس کے گھر سے روانہ ہوتی ہے تو اس وقت باہر تیز دھوپ ہے۔ بلقیس بار بار اصرار کرتی ہے کہ قدسیہ رک کر دھوپ کم ہونے کا انتظار کرے لیکن قدسیہ جلدی جانے پر مصر ہے۔ بالآخر جب بلقیس اسے رخصت کرنے کے لیے گیٹ کی طرف چلتی ہے تو قدسیہ اسے گرمی میں نہ نکلنے کی تاکید کہتی ہے۔ اس موقعے پر بلقیس کا خاوند عبدالعزیز عورتوں کے باتونی پن پر یوں طنز کرتا ہے:

''اگر ایک دوسرے کے آرام کا اتنا خیال ہے تو وہ باتیں جو عورتیں رخصت ہوتے وقت دروازے سے باہر کیا کرتی ہیں وہ یہاں برآمدے میں ہی کر لیں۔'' (۱۹)

ان شواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ نسیم حجازی کا قلم طنز و مزاح کا فطری رجحان رکھتا ہے اور بغیر کسی کاوش کے شستہ و رفتہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ چونکہ طنز اصلاح کا ایک حربہ ہے اور نسیم حجازی بامقصد ادب تخلیق کرتے ہیں، اس لیے یہ ان کی تحریروں کا جزوِ لاینفک ہے۔ البتہ مزاح کو وہ تحریر میں تازگی لانے کے لیے بطورِ حربہ استعمال کرتے ہیں۔ درج بالا مثالیں اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

نسیم حجازی کی مزاحیہ کتب کا مطالعہ

نسیم حجازی کی چار مستقل مزاحیہ تصانیف ہیں ۔ یہ ''سوسال بعد''، ''ثقافت کی تلاش''، ''سفید جزیرہ'' اور ''پورس کے ہاتھی'' ہیں۔

عمومی تحریروں کے برعکس ان کتب میں مزاح زیادہ اور طنز کم ہے لیکن یہ فرق اتنا نہیں ہے کہ قاری قہقہے ہی مارتا رہے اور کبھی کبھار کوئی ٹیس محسوس کرے۔ ان کے مطالعے کے دوران میں قاری کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قہقہے پہ قہقہہ لگاتا ہے لیکن ہر قہقہے کے ساتھ درد کی ایک ٹیس بھی محسوس کرتا ہے۔ ان تصانیف میں مزاح کی مختلف اقسام موجود ہیں مثلاً واقعاتی مزاح ، کرداری مزاح ،لفظی مزاح وغیرہ۔ چاروں کتب کے موضوعات مختلف ہونے کی وجہ سے ان کا الگ الگ مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

'سوسال بعد' میں طنز و مزاح

یہ نسیم حجازی کی سب سے پہلی مزاحیہ کتاب ہے۔ ان کا قلم 'پیش لفظ' سے ہی اپنی جولانیاں دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس تصنیف کا مسودہ قبل از اشاعت مصنف کے احباب کے پاس گھومتا اور پڑھا جاتا رہا۔ چھ ماہ کے بعد واپس آنے پر نسیم حجازی اس کی خراب حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قریباً چھ ماہ میرے قدر دان دوستوں پھر ان کے دوستوں اور ان کے دوستوں کے دوستوں کے پاس (مسودہ) گھومتا رہا۔ اب جب یہ مسودہ میرے پاس پہنچا ہے تو اس کی قریب قریب وہی حالت ہے جس کے بعد گاندھی جی کایا کلپ کی ضرورت محسوس کیا کرتے ہیں۔'' (۲۰)

اس تصنیف کا موضوع ہندومت کے ''اہنسا'' اور عدمِ تشدد'' کے وہ نظریات ہیں جو نسیم حجازی کے خیال میں بھارت کو متعدد مشکلات کا شکار کرتے ہیں۔ اس تصنیف میں تمثیلی اسلوب کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی بھی موجود ہیں۔ اس میں تمثیل کی طرح

مبالغہ ہے اور اس کے ابواب ڈرامے کے مناظر کی طرح بدلتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تمثیل اور ڈرامے کا امتزاج ہے۔ اس میں نہ صرف پاکستان کو مٹانے کی بھارتی خواہش کی تکمیلی کوشش دکھائی گئی ہے بلکہ پاکستان کو ہر قسم کے خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار دکھایا گیا ہے۔ نسیم حجازی کی اس طرح کی کتابوں میں یہی واحد کتاب ہے جو پاکستانیوں کی پے در پے سیاسی و انتظامی غلطیوں کے باعث حقیقت سے برعکس منظر پیش کر رہی ہے اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ ہندوستان روز افزوں ترقی کرتا جاتا ہے اور پاکستان روز بہ روز زوال کا شکار ہوتا جا رہا ہے لیکن غور کریں تو آج بھی نسیم حجازی کے تخیل کی کرشمہ سازی بھارت کے طول و عرض میں وہ مناظر دکھا رہی ہے جو ''سو سال بعد'' میں تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر آج دہلی دارالحکومت ہونے کے باوجود گائے ماتا اور بندر ہنومان کی بالادستی کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا ہے۔

کتاب کا آغاز 'دلچسپ پہلو' کے زیرِ عنوان ریڈیو مریخ سے نشر ہونے والے مضامین کے ایک سلسلے سے ہوتا ہے۔ مضمون نویسی کے اس مقابلے میں ایک ہندواستھانی کا مضمون انعام کا حق دار قرار پاتا ہے۔ نسیم حجازی کے خیال میں یہ مضمون 'تقسیمِ ہند سے پہلے' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس میں مضمون نگار ہندوستانی سیاست دانوں کے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کے بل بوتے پر مسلمانوں کو آزادی سے محروم رکھنے کے لیے استعمال کیے گئے مختلف ہتھکنڈے بیان کرتا ہے۔ مثلاً وہ کانگریس کی مسلم کش تجاویز کو ''تحفظات'' کے عنوان سے پیش کرتے ہیں اور یوں ان کا مزاح طنز کی چبھن پیدا کرنے لگتا ہے۔ ان میں سے مثال کے طور پر یہ نکات دیکھے جا سکتے ہیں:

> ۳۔ سرکاری مدارس میں قومی ترانہ بندے ماترم ہوگا لیکن جن مدارس میں مسلمان بچوں کی اکثریت ہوگی ان کے لیے اس کا عربی ترجمہ رائج کیا جائے گا۔
>
> ۴۔ مسلمانوں کو داڑھیاں رکھنے کی عام اجازت ہوگی لیکن مونچھیں ایسی نہ

ہوں جو مرعوب کر سکیں۔'' (۲۱)

اسی طرح ''مراعات'' کے نام پر مسلمانوں کو جو سبز باغ دکھایا جاتا ہے اس کی ایک جھلک یہ ہے:

''۱۔ ہندو اکثریت کے حقوق میں سے ۲۰ فی صدی ان مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے جائیں گے جو جیو رکھشا اور گوشت نہ کھانے کا وعدہ کریں گے۔

۲۔ اہنسا پرمودھرما کی تبلیغ کے لیے سرکاری خرچ پر جو ادارہ کھولا جائے گا اس میں ننانوے فی صدی ملازمتیں مسلمانوں کو دی جائیں گی۔

۳۔ ہندو اکثریت کے حقوق میں سے ۳ فی صدی ان مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے جائیں گے جن کے نام خالص بدیشی ہونے کی بجائے آدھے دیسی اور آدھے بدیشی ہوں۔ مثلاً یوسف گوپال اور خان چند وغیرہ۔

۴۔ گھر یا اسکول سے بھاگ جانے والے مسلمان بچوں کو ریل گاڑی میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت ہو گی۔'' (۲۲)

ان اقدامات کے باوجود مسلم لیگ الگ وطن پر سمجھوتہ نہیں کرتی تو اس کا کانگریس کے ساتھ خوش گوار ماحول میں تقسیمِ ہندوستان کا معاہدہ ہو جاتا ہے لیکن اسی اثناء میں ''ہندوستان کے جنوب میں'' اچھوتوں کا دراوڑستان کا مطالبہ زور پکڑتا ہے۔ اس کے جواب میں ہندوستان کا وزیرِ اعظم اعلان کرتا ہے:

''ہم اپنے مسائل خود طے کریں گے۔ اگر ہم مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اچھوتوں کو جو ہمارے بھائی ہیں اور ہمارے جسم کا ایک ٹکڑا ہیں خوش نہ کر سکیں .....

اگر ہمارے اچھوت بھائی ڈراوڑستان کا مطالبہ واپس لے لیں تو ہم ان کے تمام مطالبات مان لینے کے لیے تیار ہوں گے۔'' (۲۳)

یہاں اچھوتوں کو ہندوؤں کے جسم کا حصہ کہنا تو ٹھیک ہے کیوں کہ ہندو عقیدے کے مطابق پرماتما نے چار قومیں پیدا کیں لیکن انہیں اپنے برابر اور بھائی ماننا نسیم حجازی کے طنز کا کمال ہے۔ مطلب یہ کہ ہندو اپنے مفاد کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ جب اس کے بعد بھی شودر اپنے مطالبے پر قائم رہتے ہیں تو انہیں مریخ پر زمینیں اور مراعات دینے کا اعلان ہوتا ہے جس میں یہ رمز ہے کہ برہمن نیچ ذات کو کم از کم اس کرۂ ارض پر کوئی حقوق دینے کا روادار نہیں ہے۔

اس کے بعد 'بکری کی جے' کے عنوان کے تحت دیش بھگتوں کی ایک مجلس دکھائی گئی ہے جس میں وہ ملیچھوں (مسلمانوں) سے نجات ملنے (قیامِ پاکستان) کو بھگوان کی کرپا گردانتے ہیں اور جیو رکھشا کے حوالے سے اپنی مرضی کے قوانین بناتے ہیں۔ اس وقت منظر بہت مزاحیہ ہو جاتا ہے جب مہا گورو جیو ہتیا کی سزائیں تجویز کرتا ہے۔ وہ مختلف جانوروں کو مارنے اور تنگ کرنے کی سزائیں مضحکہ خیز انداز میں تجویز کرتا ہے۔ جب اونٹ کی باری آتی ہے تو اسے مسلمانوں کی جون قرار دیتے ہوئے تنگ کرنے کی کوئی سزا نہیں بتاتا۔ یہ موقع بھی طنز کا ہے کہ اونٹ بھی تو جانور ہے۔

'گستاخ سفیر' کے عنوان کے تحت نسیم حجازی یہ حقیقت کھولتے ہیں کہ ہندو کا عقیدہ ہے کہ غیر ملکی زبان بولنے سے ان کی زبان بھرشٹ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی راشٹر پتی کا سیکریٹری جب مسلمان سفیر کا نام بتاتا ہے تو نسیم حجازی یوں مزاحیہ صورتِ حال پیدا کرتے ہیں:

> ''سیکریٹری: جی یہ لکھا ہے جی۔۔۔ فخرالدولہ احتشام الملک عمادالدین ابوالاسد ظہیرالدین بابر سیف الدین یوسف عباس قاسمی راشٹر پتی: ان کم بختوں کی رگوں میں کوٹ کوٹ کر شرارت بھری ہوئی ہے۔ اب اور کوئی صورت نظر نہیں آئی تو اپنے ناموں میں بدیشی زبان کے بے شمار لفظ ٹھونس کر یہ ہماری زبان بھرشٹ کرنا چاہتے ہیں۔'' (۲۴)

اسی طرح یہ بھی ہندومت کا عقیدہ ہے کہ جانور دراصل انسانوں کی بگڑی ہوئی شکلیں

ہیں۔ آواگون کے اسی عقیدے کا ذکر کرتے ہوئے نسیم حجازی نے ہندوستانی راشٹر پتی کی گفتگو میں لکھا ہے:

''میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ اس ملک میں مچھر سے لے کر ہاتھی تک تمام جاندار ہمارے بزرگوں کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں اور ہم مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ان کے گلے پر چھریاں چلائیں۔ (۲۵)

اگلے صفحات میں 'گوشت خوروں سے چند شکایات' بھی طنز سے بھر پور ہیں۔ پھر جیو رکھشا کی تحریک کے 'تیس سال کے بعد' ہندوستان میں جانوروں کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ صورتِ حال یوں بن جاتی ہے:

''ہندو استھان کے جانوروں کو اگر انسانی آبادی پر یکساں طور پر تقسیم کیا جائے تو ہر انسان کے حصے میں اندازاً سو گائے ، تین سو بکری ، پچاس گدھے ،تیس گھوڑے ، سو بھینسیں ، ایک ہزار سانپ ، چار سو کتے ، پچاس بندر اور پانچ ہر نسل کے جنگلی درندے ایک ہاتھی،تیس اونٹ ، دو سو بلیا ، پندرہ سو مرغیاں اور دو سو بھیڑیں آتی ہیں۔ جنگلی چوپاؤں ، پرندوں ، چوہوں ،مکھیوں اور مچھروں کا کوئی شمار نہیں۔'' (۲۶)

اب ہندوستان میں جانوروں کے مقابلے میں انسانوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جانور بازار میں آجائیں تو دکانیں بند کی جاسکتی ہیں لیکن انہیں بھگایا نہیں جاسکتا۔ ٹرین پر انسانوں سے پہلے بندروں کا سوار ہونا قابلِ ترجیح ہے۔ اس صورتِ حال کو نسیم حجازی نے ہندوستان کے کسی ہوٹل میں مقیم ایک پاکستانی کے قلم سے 'میاں عبدالشکور کی رپورٹ' بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ جنگلی جانوروں کے لاتعداد ریوڑوں کے شہروں میں بلا خوف و خطر دندنانے اور جیو رکھشائی قوانین کی موجودگی میں انسانوں کی بے بسی کی مفصل حالت بیان کرتا ہے۔ اس

رپورٹ کا وہ واقعہ نہایت طنز و مزاح سے پُر ہے جس میں پندرہ بیس بندر اس کے کمرے میں گھس کر اس کے کپڑے اور کاغذات تباہ کرتے ہیں اور وہ اپنی چھڑی سے ان میں سے تین کی پٹائی کرتا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جاتا ہے اور اسے سزا سنانے پر بندر جج کا منہ چومنے لگتے ہیں:

''مجھے تین سال قید بامشقت کی سزا ملنی چاہیے تھی لیکن جج نے کمال مہربانی سے مجھے اس بات کی رعایت دی کہ میں پاکستانی تھا اور مجھ سے جو کچھ ہوا اضطراب کی حالت میں ہوا۔ اس کے علاوہ میرا حملہ مدافعانہ تھا۔ اس لیے مجھے ایک سال دو ماہ تین دن قید کی سزا دی گئی۔ جب مجھے ہتھکڑی پہنائی گئی تو بندر اپنی کرسیوں سے اچھل کر جج کی میز پر جا بیٹھے اور اس کے گلے سے لپٹ لپٹ کر اس کا منہ چومنے لگے۔ ایک بندر نے زیادہ محبت جتانے کے لیے اس کی ٹوپی اتار کر اپنے سر پر رکھ لی'' (۲۷)

چوہوں نے بھارت کے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ نسیم حجازی لکھتے ہیں:

''ہر گھر میں چوہوں کی ایک فوج رہتی ہے اور یہ انسانوں کے ساتھ اس قدر بے تکلف ہو چکے ہیں کہ عام طور پر ان کے ساتھ ہی کھانے پر بیٹھ جاتے ہیں انہیں ڈرایا جاسکتا ہے لیکن مارنے کی اجازت نہیں لیکن اب یہ بھی کھوکھلی دھمکیوں کو بے پروائی سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے لوگ کھانا کھاتے وقت بلیوں کو اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں۔'' (۲۸)

اگلا عنوان 'چوہے کی سرگزشت' ہے۔ اس میں انسانو ں کے قریب رہتے ہوئے جانوروں میں پیدا ہوجانے والے ممکنہ سماجی شعور کا جائزہ لینے کے لیے روسی سائنس دان ایک ہندوستانی چوہا اغوا کرتے ہیں۔ جب دنیا بھر کے سائنس دان اس کا آپریشن کرتے ہیں تو ہندو مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی حکومت چوہے کو بچانے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز اپنے

آدمی ماسکو روانہ کرتی ہے۔لیکن روسی حکومت اس چوہے کو تو نہیں بچاتی مگر اس کے بدلے میں ایک ہزار چوہے ہندوستان بھجواتی ہے۔تب کہیں جا کر ہندوستانیوں کو چین نصیب ہوتا ہے۔

بعد ازاں جانوروں کے نقصانات سے بچنے کے لیے 'انسدادی تدابیر' کا ذکر ہے۔ان کی تعداد کم کرنے کی بجائے شہروں اور بستیوں کے گرد مضبوط دیواریں اور خندقیں بنائی جاتی ہیں۔فصیل شدہ شہروں میں آبادی کا بے تحاشا دباؤ بڑھنے سے ''عام ہیجان'' پیدا ہوتا ہے اور باہر کی آبادیوں اور دیہاتوں کو محفوظ کرنے کے لیے توپیں نصب کرنے کی ''ایک خوشگوار تبدیلی'' رونما ہوتی ہے۔جانوروں کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ:

> '' ۲۰۱۵ء میں یورپ اور امریکہ کے سائنسدان مریخ تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن ہندواستھان کے بہترین دماغ فقط جانوروں سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کر رہے تھے۔'' (۲۹)

جانوروں کی بے پناہ کثرت ہندوستان کو ''چور بازار'' بنا دیتی ہے۔غربت کے مارے لوگ ان جانوروں کو چوری چھپے سرحد پار لا کر فروخت کرنے لگتے ہیں۔سخت حکومتی پابندیوں کے نتیجے میں لاکھوں لوگ ڈیڑھ کروڑ جانوروں کے ساتھ پاکستان آ جاتے ہیں اور نسیم حجازی انہیں ''گوشت خوروں کے مہمان'' لکھتے ہیں۔یہاں وہ اپنے جانور بیچ کر گھر بنا لیتے ہیں اور پھر اسی طرح کا ''ایک اور قافلہ'' آ پہنچتا ہے۔نتیجتاً پاکستان کی جنوبی سرحد پر ہندوؤں کی ''ایک نئی ریاست'' وجود پذیر ہوتی ہے۔اس پر پاکستان کے خلاف حکومتِ ہندوستان کا غصہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔وہ سرحد کے ساتھ ساتھ دیوار اور جانوروں کے لیے بڑی بڑی پناگاہیں بناتی ہے اور ان میں جانور پالنا شروع کرتی ہے۔

اتنے میں سائنس دانوں کا ''مریخ سے پہلا پیغام'' موصول ہوتا ہے جس میں ہندواستھان میں پائی جانے والی چھوٹے قد کی بکری کو مریخ پر آباد کرنے کی صورت میں وہاں کروڑوں انسانوں کی آبادکاری کے امکانات کی خوش خبری دی جاتی ہے لیکن ہندو اپنی بکری ماتا

کی بجائے اونٹ کو ''ملک بدر'' کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ اس میں طنز کا پہلو یہ ہے کہ ہندو انسانی بھلائی پر ہمیشہ اپنے انسانیت کش عقاید کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر ''دیوارِ ہند کا راز'' اس وقت کھلتا ہے جب اچانک اس دیوار کو بارود سے اڑایا جاتا ہے اور کروڑوں جانوروں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس ملک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں لیکن حکومتِ پاکستان اپنے انتظامات کی بدولت مضر جانوروں کی اکثریت کو ہلاک اور مُفید جانوروں کو پکڑ لیتا ہے اور دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر کے زرِ مبادلہ کماتا ہے۔

ہندوستان کو جانوروں کے اس ''طوفان کے بعد'' پلٹ کر آنے والے زخمی جانوروں کی دیکھ بھال اور ہلاک شدہ جانوروں کی ناگہانی خبروں پر ناقابلِ بیان حد تک نقصان اور صدمہ پہنچتا ہے۔ ہندواستھانی راشٹر پتی اپنی اس مہم کی ناکامی کے متعلق ریڈیو لاہور کی خبریں سنانے پر اپنے سیکریٹری کا طبی معاینہ کراتا ہے۔ اسی دوران میں ایک وزیر زخمی جانوروں کی مرہم پٹی کے سامان کے لیے امریکی صدر کو فون کرنے کی درخواست کرتا ہے جس پر راشٹر پتی اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے کیوں کہ اسے یقین ہے کہ امریکی صدر اس کا مذاق اڑائے گا۔

نسیم حجازی ''حرفِ آخر'' کے طور پر اس کتاب کی اشاعت کے ڈیڑھ برس بعد قیامِ پاکستان کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر وہ معتبر ہندوستانی اخبارات کی چند خبریں اور تبصرے پیش کرتے ہیں جن میں ''زبان کا مسئلہ''، ''چوہے''، ''جنگلی کائیں''، ''بندر''، ''درندے'' اور ''عدمِ تشدد کا مظاہرہ'' شامل ہیں۔ وہ ایسی اطلاعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں بعض احباب کے اصرار پر ان میں سے چند اطلاعات کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں کسی تبصرے کے بغیر'' (۳۰)

وہ بندروں کی کثرت و شرارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بریلی۔ ۲۱/ اکتوبر۔ جس طرح لکھنؤ میں بھیڑیوں اور لگڑ بھگوں نے آفت مچا رکھی ہے، ایسے ہی یہاں بریلی میں بعض وحشی بندر آ گئے ہیں جن

کی وجہ سے شہر میں پریشانی اور وحشت پھیلی ہوئی ہے۔ چند روز ہوئے ایک نسوانی اسکول کی کئی لڑکیوں پر حملہ کر کے بندروں نے ان کو زخمی کردیا۔ کئی بچوں کو بری طرح مجروح کر چکے ہیں۔ دو دن ہوئے ایک بچہ جو پلنگ پر سو رہا تھا، بندر اٹھا لے گئے اور اس کو بری طرح مجروح کیا کہ بچہ کی آنکھیں نکل آئیں یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ مقامی حکام نے شکاریوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بندروں کو گولی مار دیں۔'' (۳۱)

اس سے نسیم حجازی کی اس پیش گوئی کو تقویت ملتی ہے کہ حکومتِ ہند عوامی نقصانات کے بعد با امرِ مجبوری جانوروں کی ہلاکت کی اجازت دے سکتی ہے۔ دوسری طرف عوام میں جیو رکھشا کا جذبہ اس انداز میں دکھائی دیتا ہے:

''احمد آباد۔ ۲۵/نومبر۔ ٹڈی مار سرکاری دستہ جو کہ گول میں جراثیم کش سرکاری گودام میں کام کر رہا تھا کہ تیس اشخاص نے اس پر حملہ کردیا۔ دیسا قصبہ دریائے بنارس کے اس پار ایک خاردار جھاڑی لگادی گئی تھی تاکہ اس طرف سے ٹڈی دل نہ آسکیں اور فصل محفوظ رہ سکے لیکن اندھے اعتقاد کے لوگوں نے مصنوعی جھاڑی کو اکھاڑ دیا اور ٹڈیوں کے لیے سرسبز فصل برباد کرنے کے لیے راستہ کھول دیا۔ سرکاری افسروں کو یہ شکایت ہے کہ ٹڈیوں کو ہلاک کرنے کی اسکیم میں انہیں عوام کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹڈیوں پر رحم کھانا اور انہیں مارنے سے روکنے کے کام کو لوگ ثواب سمجھتے ہیں۔'' (۳۲)

نسیم حجازی کی یہ کتاب ہندومت کے بنیادی عقاید پر کڑی تنقید ہے۔ اس میں مخصوص ظریفانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اور مصنف کا قلم ''کفر کی حرکت پہ خندہ زن'' ہے۔

'سفید جزیرہ' میں طنز و مزاح

نسیم حجازی کی یہ تحریر بھی فنی لحاظ سے ڈرامے اور تمثیل کا امتزاج ہے اور خاص مقصد

کے تحت لکھی گئی ہے۔ اس میں مزاح کی گدگدی سے زیادہ طنز کے نشتر چبھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جس مقصد کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی وہ اس کی اشاعت سے قبل پورا ہو چکا تھا۔ اس بات کی تصدیق ان کی تحریر کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''میں نے قوم کے سینے پر ایک ناسور دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کے علاج کے لیے ایک قابل جراح کی ضرورت ہے۔ اب ایک کامیاب آپریشن کے بعد ملت کے وجود سے سرطان کے خطرناک پھوڑے کی جڑیں نکالی جا چکی ہیں۔ پاکستان سے سکندر مرزا کے اخراج کے بعد میرے لیے یہ مسرت کم نہیں کہ اس کتاب کا اگر کوئی مقصد تھا وہ اس کی اشاعت سے پہلے پوراہو چکا ہے۔'' (۳۳)

یہ نسیم حجازی کی خوش فہمی ہے۔ پاکستانی سیاست دانوں کی عاقبت نااندیشی قدم قدم پر اسکندر مرزا جیسے سینکڑوں رہنماؤں اور حکم رانوں کو جنم دے رہی ہے بلکہ نسیم حجازی نے اپنے خیال میں جس وجہ سے یہ کتاب لکھی تھی، وہ وجہ آج زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے کہ اسکندر مرزا کی طرح پرویز مشرف بھی غیر جمہوری اور غیر فطری طور پر برسرِ اقتدار آئے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ جنرل مشرف ''سائمن'' کی طرح فضا سے اترے اور حکم ران بن گئے نیز انہوں نے معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے اور راندۂ درگاہ سیاست دانوں کو نیب اور این۔ آر۔ او کے زور پر ساتھ ملانے اور حکومت کرنے کی کوشش کی۔

نسیم حجازی اس کے باوجود اس کتاب کی اشاعت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب اس تصنیف کا مقصد کسی سائمن کو امریکہ کا راستہ دکھانا نہیں بلکہ قوم کو ماضی کی غلطیوں کے اعادہ سے بچانا ہے۔'' (۳۴)

کتاب کا ہر عنوان ایک مکمل کہانی ہے اور ڈرامے کا ایک منظر محسوس ہوتا ہے۔ نسیم

حجازی نے انہیں ایک لڑی میں پرو کر کتاب بنا دیا ہے۔ پہلے عنوان ''مسٹر جارج کی پرواز'' کے تحت نسیم حجازی تعدد و تلون کے ذریعے طنز و مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ وہ روسی راکٹ میں سوار کرائے گئے جانوروں کی تعداد اور اقسام گنواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس راکٹ میں روس نے پانچ تربیت یافتہ کتے، تین سؤر، آٹھ بندر، گیارہ بلیاں، ڈیڑھ سو چوہے، بیس مرغیاں، آٹھ طوطے، چار کوے، تین گدھ، پندرہ سو مکھیاں، آٹھ ہزار مچھر اور مختلف بیماریوں کے پانچ لاکھ جراثیم روانہ کیے تھے۔'' (۳۵)

پھر برطانیہ میں سفرِ مریخ کے لیے ایک شخص کے انتخاب کے لیے لاٹری ٹکٹ کا اجرا اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کثیر رقم اس بات کا اشارہ ہے کہ انگریز حیلے بہانے سے دولت کمانا جانتا ہے جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی بہانے تاریخ کا حصہ ہیں۔ پھر منتخب ہونے والے جارج سائمن قہراللہ کا نیم مشرقی و نیم مغربی نام بھی ظرافت کا نمائندہ ہے۔ اس سے اس شخص کا انگریزوں کا وفادار مشرقی ہونا صاف نظر آتا ہے۔ اس کے بارے میں خود نسیم حجازی لکھتے ہیں:

''مریخ کے سفر کی لاٹری کا ٹکٹ اگر کسی انگریز کے نام نکلتا تو بھی شاید انگریز قوم کو اتنی خوشی نہ ہوتی۔ سر جارج ایک مشرقی ملک کا باشندہ ہونے کے باوجود انگریزوں سے زیادہ انگریز ہے۔'' (۳۶)

یہی نہیں بلکہ یہ کردار آگے چل کر مخلوقِ خدا کے لیے عملی طور پر بھی ''قہراللہ'' ثابت ہوتا ہے۔ راکٹ کی روانگی سے لے کر سفید جزیرے میں اترنے تک یہ باب مزاح میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ یہاں نسیم حجازی دراصل تمثیلی انداز میں تاریخ لکھ رہے ہیں۔ وہ سر جارج قہراللہ کے خاندان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھتے ہیں اس سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ میر جعفر کی اولاد میں سے ہے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ سکندر مرزا کا سلسلۂ نسب میر جعفر سے ملتا

تھا۔ پھر یہ انکشاف کہ جارج قہراللہ کے دماغ میں بندر کے غدود فٹ کیے گئے تھے، نسیم حجازی کی اس رائے کا اظہار ہے کہ سکندر مرزا مغرب کا تربیت یافتہ سیاسی شریر تھا۔

اس کے بعد قاری کو سفید جزیرے کے سادہ لوح اور معصوم عوام ''بادشاہ کے متلاشی'' نظر آتے ہیں۔ اس باب کا وہ منظر قابلِ توجہ ہے جس میں سر جارج کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی چنگ سن اسے مذہبی پیشوا کی جانب سے پہنائے جانے والے تاج کی عزت کرتا ہے۔ وہ اسے کنگ سائمن کا نام دیتا اور عوام کے سامنے مہمل تقریر کرنے کی تدبیر بتاتا ہے اور خود اس کا ترجمہ کر کے عوام کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کنگ سائمن کی پہلی تقریر کے وقت عوام سے کہتا ہے:

> ''مغرب کے سائنس دانوں نے مریخ کے ترقی یافتہ انسانوں کی نشریات سننے کے بعد وہاں کی زبان کی ایک ڈکشنری تیار کی ہے۔ جب میں یورپ گیا تھا تو مجھے اس ڈکشنری سے استفادہ کا موقع ملا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضور پرنور نے زیادہ فصاحت و بلاغت سے کام نہ لیا تو میں آپ کے سامنے ان کی باتوں کا مفہوم پیش کر سکوں گا۔'' (۳۷)

اس سے یہ پہلو روشن ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے لوگ بھی جہلاء کے ہاتھوں مجبور ہو کر قبیح فیصلوں کی پشت پناہی کرنے لگتے ہیں اور اچھے وقت کی امید پر برے نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پروٹوکول ہماری ایک بڑی بدقسمتی ہے جس پر قومی دولت بے دریغ بہائی جاتی ہے۔ نسیم حجازی نے اس پر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کنگ سائمن کو ایک سو تیس گولوں کی سلامی دی گئی اور اس کے لیے گیارہ بڑے گیٹ نصب کر کے سجائے گئے۔ راستے میں چٹائیاں بچھائی گئیں۔ سائمن کے پوچھنے پر چنگ سن کا یہ کہنا بھرپور طنز ہے:

> ''یہ کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں۔ میری قوم استقبالیہ پھاٹک تیار کرنے، چٹائیاں بچھانے اور جھنڈیاں لہرانے میں کافی مہارت پیدا کر چکی ہے۔'' (۳۸)

اگلا عنوان ''کنگ سائمن اور مادام وائٹ روز'' کے نام ہے۔ جب سائمن اپنی پرسنل سیکریٹری سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو وہ قانون کے مطابق اس کے محدود دورِ حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صرف تین سال کے لیے ملکہ بننے کی بجائے ہمیشہ کے لیے بادشاہ کی مصاحب بننے کو ترجیح دیتی ہے جس پر سائمن کہتا ہے:

> ''روز! تم کتنی نادان ہو۔'' سائمن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''میں کوئی سادھو یا درویش نہیں ہوں کہ تین سال بعد خوشی سے اقتدار کی مسند چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔۔ تاریخ گواہ ہے کہ اقتدار کے حصول کے لیے میرے خاندان کے حقیر ترین افراد بھی انتہائی کامیاب سازشیں کر چکے ہیں اور مجھے تو بن مانگے بادشاہت مل گئی ہے۔ تمہیں میرے متعلق یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ میں ان لوگوں کی سادگی اور حماقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کروں گا اور جیتے جی بادشاہت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔'' (۳۹)

یہاں ایک طرف ہمارے حکم رانوں کی رومان پرستی پر چوٹ کی گئی ہے اور دوسری طرف اسکندر مرزا کی خاندانی تاریخ پر گہری طنز کی ہے کہ وہ غداروں اور طالع آزماؤں کا خاندان ہے؛ لہٰذا اس شخص سے کسی بھی ہتھکنڈے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان میں کئی حکم ران نوے دن کے لیے آئے اور پھر سال ہا سال مقتدر رہے اور بدقسمتی سے نسیم حجازی اپنی تمام تر دانائی کے باوجود ان کے ساتھ چلتے رہے مثلاً ایوب خان اور ضیاء الحق مرحوم۔ یہ الگ بات ہے کہ مقاصد میں ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب نسیم حجازی جلد ان آمروں سے الگ ہو جاتے۔ اسی طرح جب ''مادام لوئزا'' نسیم حجازی کی کتاب اور کنگ سائمن کی زندگی کا عنوان بنتی ہے تو اسے پانے کے لیے ہز میجسٹی ملکہ وائٹ روز کا منہ نوچ لیتے ہیں اور مادام لوئزا کو یہاں تک اختیار دیتے ہیں کہ اگر وہ چاہے تو ملکہ سمیت پورے ملک کے عوام کو چوہوں کے آگے ڈال سکتی ہے۔ اس موقعے پر لوئزا کے ساتھ سائمن کی گفتگو طنز کے عروج پر ہے:

سائمن: رعایا ہم دونوں سے یکساں نفرت کرتی ہے۔ لوئزا میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اگر میں تمہاری حفاظت کا تسلی بخش انتظام کردوں اور تمہیں اپنی سلطنت میں وہ تمام حقوق دلوا دوں جو ایک ملکہ کو حاصل ہوتے ہیں تو تم یہاں سے نہیں جاؤ گی۔

لوئزا: مجھے یہ حق حاصل ہو گا کہ جب میں ملکہ سے خفا ہو جاؤں تو اسے چوہوں کے آگے ڈال دوں؟

سائمن: ہاں لوئزا تمہیں اس بات کا پورا اختیار ہو گا اور صرف اسی بات کا نہیں بلکہ کبھی اگر تمہارا موڈ خراب ہو جائے تو میں تمہیں ساری رعایا کو چوہوں کے آگے ڈالنے کی اجازت دے دوں گا۔

لوئزا: (ہنستے ہوئے) لیکن اتنے چوہے کہاں سے آئیں گے؟

سائمن: میں اس ملک کی تمام دولت باہر کے ممالک سے چوہے درآمد کرنے کے لیے وقف کردوں گا۔

لوئزا: مجھے یقین ہے کہ اس بات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ کی رعایا کو ہڑپ کرنے کے لیے آپ کے وزراء کافی ہیں.....'' (۴۰)

اس طرح نسیم حجازی نے حکم رانوں کی ''ہریالی پسندی'' کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کا قلم تحت اللفظ مسکراتے ہوئے لکھ جاتا ہے کہ وہ سامنے آنے والی ہر خوب صورت لڑکی سے شادی کرنے یا اس کے ساتھ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کنگ سائمن لیکا میکا سے شادی کا دستوری تقاضا پورا کرنے کی بجائے اپنی سیکریٹری وائٹ روز سے شادی کرتا ہے اور پھر ایک اور لڑکی لوئزا کے ساتھ رہنے کی غرض سے روز کو بھی دنیا کی سیر کے لیے بیرونِ ملک بھیج دیتا ہے۔

نسیم حجازی نے ہمارے حکم رانوں کے طولِ اقتدار کی ہوس اور اس کے لیے ان کی

کوششوں کو موضوع بنایا ہے۔ وہ ایک جگہ کنگ سائمن استعماری سوچ کی یوں عکاسی کرتے ہیں:

''میں ان کے لیے ایسے مسائل پیدا کر دوں گا جو اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں۔ تین سال بعد یہ لوگ

آلام و مصائب کے مہیب طوفانوں میں مجھے اپنا آخری سہارا سمجھیں گے۔'' (۴۱)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اقتدار کو طول دینے کی تجاویز ہمارے حکم رانوں کے ہاں ابتدا ہی سے زیرِ غور رہتی ہیں۔ اسی مقصد کے تحت وہ ہر محبِ وطن آدمی سے پنڈ چھڑانے کی کوشش رہتے ہیں۔ سائمن بھی اپنے وزیرِ اعظم چنگ سن کی حب الوطنی کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتا اور بیرونی دورے پر روانہ کرتا ہے۔ اس کے بعد اس دورے کو تادمِ آخر بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

اب نسیم حجازی ''جاپانی اخبار نویس کے مشاہدات'' کی شکل میں نئے بادشاہ کی حکومت سازی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کنگ سائمن ایک پوسٹر شائع کراتا ہے جس میں وزیروں کی ضرورت اور ان کی قابلیت کی شرائط درج ہیں:۔

''ہز میجسٹی کنگ سائمن کو وزیروں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بیکار ہیں۔ آپ عزت کی روٹی کمانے کا کوئی ڈھنگ نہیں جانتے ہیں تو کنگ سائمن کی خدمت میں یہ درخواست بھیجیے کہ آپ کو وزیر بنا دیا جائے۔ آپ کو وزارت کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط پوری کرنی پڑیں گی:

۱۔ ملک کے کسی پولیس اسٹیشن میں آپ کے جرائم کا ریکارڈ موجود ہو۔

۲۔ آپ کم از کم تین سال ملک کے کسی جیل یا پاگل خانے میں رہ چکے ہوں۔

۳۔ آپ کی تعلیم صرف اس قدر ہو کہ آپ اپنا نام پڑھ سکیں۔

۴۔آپ کے محلے یا کم از کم آپ کے گھر کے تمام افراد اس بات کی گواہی دیں کہ آپ نے اپنی زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا۔'' (۴۲)

یہاں طنز و مزاح مخلوط حالت میں بلند سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آج پاکستان میں وائس چانسلروں تک کے مناصب کے لیے اخبارات میں اشتہارات دیے جاتے ہیں۔

حکم ران اپنی نا اہلی کو چھپانے کے لیے لاتعداد وزیر مشیر رکھتے ہیں۔ پاکستان میں یہ تعداد قابلِ توجہ ہے۔ ایک ایک وزارت کو کئی کئی حصوں میں تقسیم کر کے کئی کئی وزیر بنائے گئے ہیں۔ مثلاً وزیرِ دفاع ، وزیرِ دفاعی پیداوار اور مشیر سلامتی امور وغیرہ۔اس پر وزرائے مملکت مستزاد ہیں۔البتہ اب یوسف رضا گیلانی وزیرِ اعظم نے وزارتوں کو اکٹھا کرنے کا کام شروع کیا ہے لیکن یوسف رضا گیلانی کے اکثر وزیر بھی این۔ آر۔ او زدہ اور خود حکومت کو مختلف مقدموں میں مطلوب ہیں۔ پھر حکم ران اس ''ٹڈی دل'' کا جواز پیش کرتے ہیں۔ سائمن اپنے وزراء کی ان خصوصیات کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ ملک سے جرائم کو ختم کرنے کے لیے ایسے لوگوں کو اختیار دینا ضروری ہے جو ان جرائم کے طریقہ ہائے واردات سے واقف ہوں اور جرائم پیشہ افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد سے روابط رکھتے ہوں۔ اس اشتہار کو نسیم حجازی نے جاپانی رپورٹر کی طرف سے بیان کیا ہے اور یہ ان کا کمالِ فن ہے ورنہ اسے نسیم حجازی کی ذاتی خواہش سمجھا جاتا۔پھر ان وزراء کو اچھے برے کاموں میں ساتھ رکھنے اور مخالفت سے باز رکھنے کے لیے سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔ یہ کام ہمارے اکثر حکم رانوں نے بالعموم اور سکندر مرزا نے بالخصوص کیا ہے کہ شاملانِ حکومت میں سے ہر ایک کو الگ الگ دعوت پر بلا کر آئندہ وزیر بنائے جانے کا عندیہ دیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے حکم ران اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے ایسے افراد کو چن چن کر اپنا نائب بناتے ہیں جو عوام کی زندگیاں اجیرن کرنے میں اپنے پیش روؤں سے بڑھ کر

ہوں اور خود عوام کا مسیحا ہونے کے دعوے کرتے رہیں۔ یہی انداز نسیم حجازی نے کنگ سائمن کا بتایا ہے۔ وہ بالآخر وطن کے بدترین غدار ایجو لیجو کو وزیرِ اعظم بنا تا ہے جو سفید جزیرے کے ازلی دشمن ''کالے جزیرے'' کا ایجنٹ ہے۔

''وزیرِ اعظم کا انتخاب'' اس مزاحیہ کتاب کا مغز ہے۔ نسیم حجازی اس اہم عہدے کے لیے اہلیت کی شرائط پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وزیرِ اعظم کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ ذکاوتِ حس سے قطعاً محروم ہو۔ وہ کسی ضابطۂ اخلاق کی بجائے صرف اپنی کرسی سے محبت رکھتا ہو اور اپنی کرسی پر قبضہ رکھنے کے شوق میں گالیاں تک برداشت کرنے کا عادی ہو۔ ایک عام وزیر ذہین، ہوشیار یا چالاک ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک وزیرِ اعظم کی بہتری اس بات میں ہے کہ وہ پرلے درجے کا غبی ہو۔'' (۴۳)

پھر وزارتِ عظمیٰ کے لیے ''مخصوص'' معیار پر پورا اترنے والے چھ امیدواروں میں سے موزوں ترین کا انتخاب کرنے کے لیے انہیں باری باری گالیاں دی اور جوتے لگائے جاتے ہیں۔ ''شوشلنگ'' سب سے زیادہ خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرتا ہے، لہٰذا اسے وزیرِ اعظم بنایا جاتا ہے۔ اس عمل کی دل چسپی کے متعلق شگفتہ الطاف لکھتی ہیں:

> ''سائمن جس کا دماغ بندر کا ہے اور جس کے لیے ایک عام انسان کی حیثیت سے جینے کی اجازت بہت بڑی چیز تھی اسے قدرتی صلاحیتوں سے مزیّن انسانی دماغ خود پر حاکم کرلیں تو ''وزیرِ اعظم کا انتخاب'' بڑا منفرد، یادگار اور دل چسپ ہوجاتا ہے۔'' (۴۴)

> ''کنگ سائمن کی پہلی سالگرہ'' کی تقریب میں آتش بازی کا مرحلہ اس وقت خندہ ریزی کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے جب ہز میجسٹی بندر پن کا

مظاہرہ کرتے ہوئے درخت پر چڑھ بیٹھتے اور اتارنے والوں کو کاٹ کھاتے ہیں۔ اس واقعے کا اشارہ صاف صاف ہمارے حکم رانوں کی الٹی سیدھی اور مضحکہ خیز حرکتوں کی طرف ہے۔

وزراء کے اللے تللوں کے لیے رقوم کی فراہمی کی غرض سے بے تحاشا ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ نسیم حجازی کا قلم حکم رانوں کے ایسے ہتھکنڈوں پر اس انداز میں خندہ زن ہے کہ سائمن کی نیشنل اسمبلی میں نئے ٹیکسوں کے امکانات پر بحث کے دوران میں ایک رکن کے خیالات یوں ہیں:

''اب ایک نائب وزیر نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ پیدائش، شادی، موت اور کفن دفن پر بھی ٹیکس عائد کیے جائیں۔ دوسرے ممبر نے یہ تجویز پیش کی کہ پیدائش، شادی اور موت کے علاوہ بھی انسان کی زندگی میں کئی اہم مراحل آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض بچے شادی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں اور حکومت کو شادی ٹیکس سے محروم ہونا پڑے گا، اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ پیدائش کے بعد پہلا لباس پہننے پر ٹیکس لگائے جائیں۔ پھر ہر سالگرہ پر ٹیکس لگائے جائیں۔ اس کے علاوہ دانت نکلنے اور داڑھی کے بال اگنے پر بھی ٹیکس عاید کیے جائیں'' (۴۵)

وقت کے ساتھ ساتھ سائمن کے ہتھکنڈے واضح ہوتے اور اس کے خلاف عوام میں نفرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حکومتی عدم استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے حتّٰی کہ سفید جزیرہ میں ''نئی وزارت اور نئے مسائل'' کا عنوان رقم ہوتا ہے۔ سائمن سیاسی شاطر ہے۔ وہ وزارتوں کے عرصے کو بتدریج سکیڑتا ہوا پندرہ پندرہ دن تک لے آتا ہے۔ اس نے یہ کھیل جاری رکھنے کے لیے دس سیاسی جماعتیں بھی بنا رکھی ہیں۔ ان میں چپقلش کا جاری رہنا اس کی حکومت کے

لیے مفید ہے۔ نسیم حجازی نے اسمبلی ہال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ طنز و مزاح میں آپ اپنی مثال ہے۔ پانچ پارٹیاں ایک گیلری میں اور پانچ دوسری گیلری میں کھڑی ہیں۔ فلور کراسنگ میں سہولت پیدا کرنے کے لیے درمیان میں جھولے لگائے گئے ہیں اور ان کی مدد سے ایک گیلری سے دوسری کی طرف آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ ہاتھا پائی میں ممبران کے کوٹ پھٹتے اور نکٹائیاں ٹوٹتی ہیں۔ یہ منظر بیان کرتے ہوئے نسیم حجازی لکھتے ہیں:

> ''جب لیلائے وزارت کے دیوانے جھولوں کی مدد سے ایک گیلری سے دوسری گیلری پر پھلانگنا شروع کرتے تو یہ کھیل نازک صورت اختیار کر جاتا تھا۔ بعض طاقتور اور زندہ دل ممبر اپنے مضبوط ہاتھوں سے جھولا پکڑتے اور ٹانگوں میں کسی کمزور ممبر کو دبوچ کر دوسری گیلری کی طرف کود پڑتے۔ رسّے کافی مضبوط تھے لیکن کبھی ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی یا کمزور ممبر تھوڑی بہت مدافعت کرتا تو وہ آنکھ جھپکنے کی دیر میں نیچے پہنچ جاتا۔ تنے ہوئے جال پر گرنے کے باعث ممبر حضرات کی جان تو بچ جاتی لیکن بعض صاحبان جال سے اچھل کر فرش پر گرنے کے باعث اپنے جسم کی ایک آدھ ہڈی سے محروم ہو جاتے۔'' (۴۶)

جب ملک تباہی کے کنارے پہنچ جاتا ہے اور سائمن مخالف اضطراب بہت بڑھنے لگتا ہے تو نسیم حجازی ''حسین وعدے'' کا عنوان تحریر کرتے ہیں جس میں کنگ سائمن اپنے بدنامِ زمانہ وزراء کو امیدوں اور عوام کو ''نا اہل عہدے داروں'' کے لیے قرار واقعی سزا کے نئے نئے مژدے سناتا ہے۔ پھر کنگ سائمن کی وہ ''ملاقاتیں اور مشورے'' دکھائے گئے ہیں جن میں وہ بد سے بدتر اور بدترین وزراء تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ عوام کو اس قدر پریشان کیا جائے کہ وہ بادشاہ کے خلاف سوچنے تک کی ہمت نہ پائیں۔ اس ''جدو جہد'' کے نتیجے میں ہز میجسٹی زیادہ سے زیادہ وزراء کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نسیم حجازی کا قلم ''وزارتیں اور

وزارتیں'' لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے سفید جزیرے کے وزراء کی بازی گری کی شہرت بیرونِ ملک پہنچ جاتی ہے اور جاپانی سرکس کا ایک افسر اپنے سرکس کے لیے کنگ سائمن سے ایک بوڑھے وزیر کی خدمات کے حصول کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ اس موقعے پر نسیم حجازی کا قلم یوں خندہ زن ہوتا ہے:

> اعلیٰ حضرت نے جواب دیا۔'' ایسے باکمال آدمی کی ہمیں یہاں زیادہ ضرورت ہے۔ ہم اسے وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ پیش کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اگر آج یا کل اس کی کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ نہ گئی تو پرسوں یہ ہمارا تیسواں وزیرِ اعظم ہوگا۔ تم اگر چاہو تو ہمارے موجودہ وزیرِ اعظم سے معاملہ کر سکتے ہو۔ پرسوں دوپہر تک اس کی وزارت کے دو ہفتے پورے ہو جائیں گے اور اسے ہماری طرف سے آپ کے سرکس میں ملازمت کرنے کی اجازت ہوگی۔''
>
> جاپانی بازیگر نے کہا۔''نہیں جناب! ایسے فنکار تو ہمارے سرکس میں بھی موجود ہیں۔''
>
> سائمن نے جواب دیا۔''اگر تم اس بوڑھے کی خدمات حاصل کرنے پر بضد ہو تو تمہیں پندرہ بیس دن انتظار کرنا ہوگا اور اتنے عرصہ میں ہم اسے وزارت کے عہدے سے سبکدوش کر دیں گے۔'' (۴۷)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کنگ سائمن کو ایک سے بڑھ کر ایک بازی گر کی ضرورت ہے اور وزارت کی مدت بھی دو یا تین ہفتوں سے زیادہ نہیں رہی۔ عوام میں وزراء کے خلاف اتنی نفرت پیدا ہو چکی ہے کہ ہر شریف آدمی حکومتی عہدے کو کسی جرم کی سزا سمجھتا ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال اس وقت سامنے آتی ہے جب سائمن سفید جزیرے کے مشہور تاجر چیک میک کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ پیش کرتے ہیں:

کھانے کا نوالہ چیک میک کی حلق میں اٹک کر رہ گیا اور اس نے جلدی سے پانی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد اس بکری کی طرح جس کی گردن پر اچانک چھری رکھ دی گئی ہو حضور والا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''عالی جاہ! مجھے پرسوں ہی ایک نجومی نے یہ بتایا تھا کہ مجھ پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔''

اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''تم وزارتِ عظمیٰ کو ایک مصیبت خیال کرتے ہو؟''

چیک میک نے جواب دیا۔ ''عالی جاہ! میں آپ کا ناچیز خادم ہوں اور میرے لیے یہی عزت کافی ہے۔ اگر میری آنکھوں سے کوئی گستاخی ہوئی ہے تو میں انہیں نکلوانے کے لیے تیار ہوں لیکن میرے ساتھ یہ مذاق نہ کیجیے۔''

سائمن نے کہا۔ '' ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ تمہیں اپنی سلطنت کا سب سے بڑا عہدہ پیش کرتے ہیں۔''

چیک میک نے گھگھیا کر کہا۔ ''حضور! اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو مجھے بید مار لیجیے۔ قید خانے میں بھجوا دیجیے۔ میرا منہ کالا کر دیجیے اور مجھے گدھے پر سوار کر کے گلی گلی پھرائیے۔ لیکن مجھے وزیر بنانے کی سزا نہ دیجیے۔'' (۴۸)

اس پر نسیم حجازی کی اس کتاب میں '' سائمن کا اضطراب'' نظر آتا ہے جس میں اسے آخری سہارے کے طور پر ایسے وزیرِ اعظم کی ضرورت ہے جو جہاں دیدہ اور بے ضرر ہو۔ نسیم حجازی اس مقصد کے لیے ہز میجسٹی کے معیارِ انتخاب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مرتبہ ایک ایسے شخص کو پسند فرمایا جو قریباً تمام سابقہ وزارتوں میں شامل رہ چکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی بینائی کمزور تھی اور وہ سرکاری کاغذات پر پڑھے بغیر دستخط کرنے کا عادی تھا۔'' (۴۹)

سیاسی اضطراب کے علاوہ اب '' گھر کے بھیدی'' لنکا ڈھانے کے لیے کمر بستہ ہو چکے تھے۔ ملکہ وائٹ روز کی کتاب ''کنگ سائمن کے ساتھ ایک سال'' اور اس کے بعد لوئزا کی

کتاب ''کنگ سائمن کے ساتھ پانچ برس'' جارج سائمن کے ہوش اڑا دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چنگ سنگ ''سفید جزیرے کا راکٹ'' لے کر سفید جزیرے کی بندرگاہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وائٹ روز بھی ہے۔ کتاب کا آخری عنوان ''اعلیٰ حضرت کی روانگی'' ہے جس میں کنگ سائمن کی بے چینی سو فی صد اسکندر مرزا کی بے چینی بن جاتی ہے اور ملکی فوج کا سپہ سالار یعنی جنرل ایوب خاں اقتدار سنبھال لیتا ہے اور ہز میجسٹی کو خلائی راکٹ میں سوار کر کے ''مریخ'' کی جانب روانہ کر دیا جاتا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب کے کئی کرداروں کے نام بھی مزاح کا ذریعہ ہیں۔ مثال کے طور پر بادشاہ کا نام 'سر جارج سائمن قہراللہ' اور اس کی سیکریٹری کا نام 'نیلوفر یاسمین الزبتھ براؤننگ ریڈ اسٹار ایور گرین شو سرنگ مرنگ وائٹ روز۔ یوں مسلمانوں کے پر تکلف القابات پر طنز کرنے کے علاوہ ان تاریخی ناموں سے ہندوؤں کے اندرونی خوف کو سامنے لا کر اس کے استہزاء کی کوشش کی گئی ہے۔

جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی تھی اگرچہ وہ اس کی اشاعت سے قبل پورا ہو چکا تھا لیکن اس روش کی حوصلہ شکنی اور لوگوں کو ایسے شاطروں کی چال بازیوں سے خبردار رکھنے کے لیے یہ ایک مستقل کتاب ہے جو رہتی دنیا تک مؤثر رہے گی۔ اسی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے شگفتہ الطاف لکھتی ہیں:

> ''اس تمثیلی کتاب کا مقصد یہ بھی تھا کہ نابلد عوام کو شاطر حکم رانوں سے محتاط رکھا جائے۔ جس حکم ران کے لیے نسیم حجازی نے یہ کتاب لکھی وہ اشاعت سے قبل روانہ ہو گیا تھا لیکن نسیم حجازی کا یہ درس تا عمر کتاب کی صورت میں قائم رہے گا کیونکہ اس کا پیرایۂ بیان انتہائی دلچسپ ہے۔'' (۵۰)

شگفتہ الطاف کی درج بالا رائے نسیم حجازی کے حق میں قاطعِ برہان ہے اور اس بے بنیاد دعوے کا معقول رد ہے کہ نسیم حجازی محض ہیجان انگیز تحریریں لکھتے ہیں جن کے اثرات قطعاً

وقتی ہیں جب کہ یہ بات تواتر سے سامنے آرہی ہے کہ پاکستان میں یکے بعد دیگرے بہت سے سائمن برسرِ اقتدار آتے رہے ہیں اور اگر عوام نے توجہ نہ کی تو یہ سلسلہ ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔

'ثقافت کی تلاش' میں طنز و مزاح

فنی نقطۂ نظر سے یہ کتاب ڈرامہ نما ہے۔ مصنف نے اسے بارہ مناظر میں تقسیم کیا ہے جن کے درمیان کہیں کہیں 'وقفہ' بھی ہیں۔ اسے سٹیج نہیں کیا جاسکتا البتہ ٹیلی وژن ڈرامہ سیریل کہنے کی کافی گنجائش ہے۔ دراصل نسیم حجازی نے یہ کتاب لکھتے وقت بھی مقصد کو سامنے رکھا ہے، فن کو نہیں۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی نام نہاد ثقافت اور اسے پھیلانے کے حربوں پر متعدد بار نشترِ طنز آزمایا ہے۔ وہ خود اس تصنیف کی فنی حیثیت کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'ثقافت کی تلاش' کو فنی اعتبار سے ڈرامے، کہانی یا ناول کی صنف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۵۶ء میں راقم الحروف نے ''ثقافت'' کی حمایت میں بعض ''فن کاروں'' کا واویلا سن کر ایک قہقہہ لگایا تھا اور یہ قہقہہ اس قدر بے ساختہ تھا کہ اس کو ادب کی کسی خاص صنف کا نام دینا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔'' (۵۱)

لیکن نسیم حجازی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جس ثقافت کو اسلام اور شائستگی کے خلاف تصور کرتے تھے، آئندہ زمانوں میں ملک کے چیف آف آرمی سٹاف اور صدرِ مملکت اسی ثقافت کے نمائندے ہوں گے۔ جیو ٹی وی پاکستان سے متعدد بار نشر ہونے والا وہ پروگرام کسے یاد نہ ہوگا جس میں جنرل پرویز مشرف، حامد علی خان کے ساتھ سُر ملانے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔

نسیم حجازی کی دیگر تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی طنز و مزاح کا مرقع ہے۔ اس کتاب کا موضوع کمیونزم اور سوشلزم کی تحریکیں ہیں جن کی مدد سے پاکستان کے مسلمان کو لادین بنا کر اس مملکتِ خداداد کی نظریاتی سرحدوں کو کمزور بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ جب لوگوں نے ایک معاشی نظام کی حیثیت میں سرخ سویرے کو قبول نہ کیا تو نام نہاد دانش وروں نے

پینترا بدل کر ''ثقافت'' کے نام پر اس قوم کا ایمان چھیننے کے حربے شروع کیے۔ان حالات میں نسیم حجازی جیسا محبِ وطن اور حساس مصنف چپ نہ رہ سکا اور اس کا قلم ''ثقافت کی تلاش'' میں رواں ہوگیا۔

اسلام مخالف لوگوں نے ''ترقی پسندی'' کو نئے انداز میں بڑھاوا دینے کی کوشش کی جو کماحقہٗ ناکام ہوئی۔ اس سلسلے میں نسیم حجازی لکھتے ہیں:

> ''1956ء میں جب ۔۔۔۔۔ ہمارا ہر قدم پستی کی طرف اٹھ رہا تھا ۔۔۔۔ٹھیک اسی وقت نام نہاد ترقی پسندوں کے لشکر نے بھی ثقافت کے محاذ سے پاکستان کی اخلاقی اور روحانی قدروں کے حصار پر دھاوا بول دیا اور ۔۔۔۔۔۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ان کے عظیم ''فن کاروں'' نے قلم پھینک کر ڈھول اور طبلے اٹھا لیے۔'' (۵۲)

زیرِ نظر کتاب کے پہلے منظر میں ترقی پسندوں کے ایک اجلاس کے دوران میں کامریڈ الف صدارتی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے شرکائے اجلاس کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے نئے طریقۂ کار اور اس کی کامیابی کے امکانات یوں سمجھاتا ہے:

> ''کمیونزم کا نعرہ لگانے کی بجائے اسلام کا نام لے کر سادہ دل عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو یہ کام نسبتاً آسان ہوگا'' (۵۳)

اسی طرح وہ اپنے ساتھیوں کو لفظی ہیر پھیر کی تلقین بھی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر شریف آدمی اپنی بہن بیٹی کو رقاصہ کی بجائے آرٹسٹ کہلوانا پسند کرے گا اور مجرے کو کلچرل شو کہہ کر عام آدمی کو اس کا ٹکٹ خریدنے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ تربیتی اجلاس کے بعد کامریڈ نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ گانے بجانے کے آلات مثلاً ڈھول ، چمٹا اور گھنگھرو وغیرہ کے ساتھ ایک دور افتادہ گاؤں میں پہنچ جاتے ہیں تاکہ سادہ لوح دیہاتیوں کو ''ثقافت'' کی تبلیغ کریں۔ جب کامریڈ نمبر ۹ ایک دیہاتی لڑکی کو اپلے تھاپنے کے دوران میں گنگناتے ہوئے سنتا ہے تو اپنی نوٹ بک لے

کر اس کا گیت نوٹ کرنے کی غرض سے چپکے سے اس کے قریب جاتا ہے۔ وہ گھبراہٹ میں پیچھے ہٹتا ہوا خوب مزاحیہ منظر پیش کرتا ہے:

''کامریڈ نمبر ۹ اپنی نوٹ بک اور قلم لیے اٹھتا ہے اور دبے پاؤں لڑکی کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہے۔ لڑکی کا گیت سننے کی کوشش میں وہ آگے جھکتے جھکتے اپنا کان بالکل اس کے قریب لے جاتا ہے، لڑکی گاتی ہے:

کالی ڈانگ میرے ویر دی

جتھے وجدی بدل وانگ گجدی

(کامریڈ نمبر ۹ گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کا ایک پاؤں تازہ گوبر کے اُپلے پر جا لگتا ہے۔ وہ پاؤں جھاڑتا ہے اور لڑکی چونک کر پیچھے دیکھتی ہے)'' (۵۴)

لڑکی کے شور مچانے پر دیہاتی آجاتے ہیں اور دونوں کامریڈ خود کو بہروپیے ظاہر کر کے جان بچاتے ہیں۔ پھر ساگ توڑتی ہوئی عورتوں کو ناچتی خواتین سمجھتے ہیں اور ایک دیہاتی سے اس ناچ کے متعلق پوچھ کر بے عزتی کراتے ہیں حتیٰ کہ یہاں بھی مار پڑنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے لیکن وہ ایک ساتھی کی نظر کمزور ہونے کا بہانہ کر کے بچ نکلتے ہیں۔

تیسرے منظر میں ایک چوڑا چکلا پہلوان نما دیہاتی پیال کے ڈھیر پر بیٹھا ہیر وارث شاہ گا رہا ہے۔ دونوں کامریڈ اسے عشق کا روگی سمجھ کر اس کے جذبات کو انگیختہ کرنے کے لیے لب و رخسار کے قصے چھیڑتے ہیں جس پر وہ پہلے سرزنش کرتا ہے کہ ہم دیہاتی ایسے نہیں ہیں لیکن جب یہ باز نہیں آتے تو اپنے جوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''تم نے یہ دیکھا ہے؟'' (۵۵)

اس جوتے کے متعلق ایک کامریڈ کی رائے ہے کہ یہ جمبو سائز جوتا جنگلی جانوروں کو مار ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ یوں نسیم حجازی نے یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسند ہر محاذ پر پٹتے رہے لیکن ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نت نئے رنگ میں اپنی مذموم کوششیں

جاری رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

وہ منظر قابلِ دید ہے جس میں دیہاتی نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہیں جب کہ کامریڈ سمجھتے ہیں کہ وہ سب بھنگڑے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اس پر وہ ناچنے کی تیاری کرتے ہیں۔ کامریڈ نمبر ۱۰، نمبر ۹ کو لنگوٹا باندھنے کا حکم دیتا ہے تو وہ ہچکچاہٹ کا اظہار کرتا ہے:

> کامریڈ نمبر۹: کامریڈ! میں احتجاج کرتا ہوں۔ میں شدید احتجاج کرتا ہوں۔ میری ٹانگیں اس قابل نہیں کہ دیہاتیوں کے سامنے ان کی نمائش کی جائے۔ میری رانیں میری پنڈلیوں سے بھی زیادہ پتلی ہیں۔'' (۵۶)

جب وہ ڈھول کے ساتھ ناچ شروع کرتے ہیں تو لوگ ان پر ڈھیلوں اور جوتوں کی بارش کرتے ہیں۔ کامریڈ نمبر ۱۰ کو جان بچانے کے لیے نہر میں کودنا پڑتا ہے جب کہ کامریڈ نمبر ۹ کی پتلون بھاگتے ہوئے کہیں گر جاتی ہے۔ دوبارہ اکٹھے ہونے پر ان کی گفتگو یوں ہوتی ہے:

> ''نمبر۹: بھئی میری پتلون تو بھاگتے ہوئے سر سے گر پڑی تھی اور ایسا موقع نہ تھا کہ میں مڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن میں اس کے بدلے ایک شاندار تحفہ لایا ہوں۔
>
> نمبر۱۰: وہ کیا ہے؟
>
> نمبر۹: (ایک بھاری بھرکم جوتا بغل سے نکال کر کامریڈ نمبر ۱۰ کے آگے پھینکتے ہوئے) اسے غور سے دیکھو۔ اس پر کم از کم ایک بھینس کی کھال صرف ہوئی ہوگی۔ یہ تمام دنیا کے جوتوں کا سردار ہے اور ثقافت کے دشمن اسے اسلحہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔'' (۵۷)

پھر اس مہم میں کامریڈ نمبر ۱۰ کی آپ بیتی بھی بہت لطف آمیز ہے۔ وہ پھٹے ہوئے ڈھول میں پھنسا ہوا بھاگ رہا ہے۔ ایسے میں وہ دیکھتا ہے کہ ایک دیہاتی اپنا بھینسا لیے جا رہا ہے۔ کامریڈ دیہاتی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے ڈھول سے نکلنے میں مدد دے لیکن

دیہاتی اسے بھوت سمجھ کر شور مچاتا ہوا بھاگ جاتا ہے جب کہ بھینسا کامریڈ کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ بھاگ کر جان بچانے کی اپنی سرگزشت یوں بیان کرتا ہے:

''میں بھاگا اور اگرچہ اس بے بسی کی حالت میں بھاگنا آسان کام نہ تھا تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر میری رفتار ریکارڈ کی جاتی تو تم لوگ مجھے آئندہ کبھی یہ طعنہ نہ دیتے کہ میری ٹانگیں ٹیڑھی ہیں۔'' (۵۸)

نسیم حجازی یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ اس ملک میں اسلام مخالف تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہاں کی پیشہ ور رقاصہ بھی یہ دھندا مجبوراً کرتی ہے۔ ریشماں جس کو دونوں کامریڈ اپنے مشن کے لیے سب سے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں، کامریڈ نمبر ۹ کا مذاق اڑاتی ہے۔ جب وہ اپنے باپ کی تنخواہ چار سو روپیا ماہانہ بتاتا ہے تو وہ اسے جھوٹا کہتی اور دلیل پیش کرتی ہے کہ اگر اس کے باپ (جھنڈو) کی آمدنی تیس روپے ماہوار بھی ہوتی تو وہ اسے (ریشماں کو) ناچنا تو دور کی بات ہے، گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی نہ دیتا۔ اس کی زبانی اس کے جذبات کا اظہار نسیم حجازی نے یوں کیا ہے:

''میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا ہو جو میرے گھر کے دروازے پر پہرا دے سکے۔ جو مجھے یہ کہے کہ ریشماں! مجھے تمہارا یہ پیشہ پسند نہیں۔ میں تجھے عزت کی روٹی دینے کے لیے مزدوری کروں گا اور اپنا خون اور پسینہ ایک کردوں گا لیکن تمہیں لوگوں کے سامنے ناچنے اور گانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ جب تم میرا مذاق اڑا رہے تھے تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ کاش کوئی میری عزت کا نگہبان ہوتا اور تمہارا گلا دبوچ لیتا۔'' (۵۹)

آخری منظر میں دونوں کامریڈ باہم گفتگو کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کے علاوہ کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہی اس کتاب کا مقصدِ تحریر ہے۔ نسیم حجازی لکھتے ہیں:

''کامریڈ نمبر۹: دیکھو بھائی! ریشماں کے طرزِ عمل سے مجھ پر صرف یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ وہ ایک عورت ہے۔۔۔۔ اس ملک کی عورت ، جہاں اپلے تھاپنے ، ساگ توڑنے ، دودھ بلونے اور چرخہ کاتنے والی لڑکیاں اپنے بھائیوں کی کالی ڈانگوں کی تعریف میں گیت گاتی ہیں ۔ جہاں ایک ڈوم کی آوارہ مزاج لڑکی کی بھی آخری خواہش یہی ہوتی ہے تاریک راتوں میں کوئی رمضان اس کے دروازے پر پہرا دے رہا ہو۔'' (۶۰)

اس کتاب میں واقعاتی مزاح کے علاوہ کرداری مزاح بھی بڑی مقدار میں موجود ہے۔ اس کے ایک کردار کامریڈ نمبر ۹ کے متعلق شگفتہ الطاف لکھتی ہیں:

''یہ کردار لفظی اور واقعاتی مزاح بڑی آسانی سے جنم دیتا ہے مثلاً جب یہ شخص بھنگڑے کے لیے لنگوٹا باندھتا ہے اور پتلون کو سردی کے موسم میں بھی اتار کر سر پر باندھ لیتا ہے اور جوتا ایک طرف رکھ کر ناچنا شروع کر دیتا ہے۔'' (۶۱)

سچ تو یہ ہے رمضان اور ریشماں کے کردار ہی مقصدِ تحریر کے حصول کے لیے تراشے گئے ہیں۔ جب کہ کامریڈ نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ نام نہاد ترقی پسندوں کا مذاق اڑانے کے لیے پیش کیے گئے ہیں اور یہ بھی اس تحریر کا ایک مقصد ہے۔ اس ضمن میں شگفتہ الطاف کا کہنا ہے:

''کہانی کا مقصد ان ترقی پسندوں کی تحریک پر مزاح کے پردے میں طنز کی کاری ضرب رسید کرنا ہے جو ترقی پسندی کے نام پر تو عوام کو مکمل طور پر گمراہ نہ کر سکے لیکن ''ثقافت'' کے تام پر پاکستانی مسلمانوں کو اسلام سے دور کر کے رقص و موسیقی کی تعلیم دے کر کمیونزم کا پرانا مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔'' (۶۲)

اس ڈرامے کا ہر منظر ایک مکمل کہانی ہے جس کا باقاعدہ آغاز ،عروج اور انجام ہے۔ یہ

کہانیاں پڑھتے ہوئے قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ جلد از جلد ان کرداروں کے ساتھ کوئی اور واقعہ پیش آئے۔ اس کتاب میں دل چسپی کے تمام لوازم پائے جاتے ہیں۔ شگفتہ الطاف کا کہنا ہے:

''ایک واقعے کے ختم ہونے کے بعد جی چاہتا ہے کہ اب جلد ہی ان کرداروں کو کوئی اور دلچسپ واقعہ پیش آئے اور قاری مزید لطف اندوز ہو سکے۔'' (۶۳)

یہ کتاب نسیم حجازی کی مزاحیہ تحریروں میں سب سے برتر ہے۔ اس میں پلاٹ، کردار، مکالمے اور مناظر سبھی کچھ معیاری اور بھرپور ہے۔ نسیم حجازی نے اس تحریر کے ذریعے ترقی پسندوں پر بھرپور چوٹ کی ہے اور اپنے قاری کو یہ بتانے میں کامیاب رہے ہیں کہ انہوں نے نام نہاد ثقافت کی ترویج کے لیے بہت پینترے بدلے اور حیلے کیے لیکن ہر دفعہ نہ صرف ناکامی کا منہ دیکھا بلکہ نفرت و حقارت کا نشانہ بھی بنے۔

'پورس کے ہاتھی' میں طنز و مزاح

نسیم حجازی کی اس کتاب میں بھی مزاح کے پردے میں سوچ بچار کا مادہ موجود ہے۔ وہ پاکستان کے مسلمان کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہندو کبھی اس کا وجود برداشت نہیں کر سکا اور نہ ایسا ہو گا۔ وہ ہندو کو پاکستان اور مسلمان کا ازلی دشمن سمجھتے ہیں اور اس پیغام کو پاکستانیوں تک پہنچانے کو اپنا اولین فرض خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ پیش لفظ میں اس کتاب کے مقصدِ تحریر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پورس کے ہاتھی'' امن اور انسانیت کے اس عظیم دشمن کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کی ایک اور کوشش کا ماحصل ہے ..... ایک مختصر اور غیر سنجیدہ تحریر جسے پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ چند قہقہے پاکستان کے ان جیالے سپاہیوں کے رہینِ منت ہیں جن کی مسکراہٹیں جنگ کے ایام میں پوری قوم کے لیے سرمایۂ حیات بن گئی تھیں۔ یہاں پر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ سانپ بھیس بدل سکتا ہے، بل

میں گھس سکتا ہے لیکن اپنی سرشت تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسے صرف چوکس اور بیدار انسان کے ہاتھ کی لاٹھی ہی بے ضرر بنا سکتی ہے اور وہ سانپ جو زخمی ہونے کے بعد کنڈلی مار کر دم سادھ لیتا ہے لاٹھی کے بغیر جنگل میں سفر کرنے والے مسافروں کے لیے بسا اوقات پھنکارنے والے سانپ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ پاکستان کے دس کروڑ انسانوں کی اجتماعی حیات کا اولین تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی اور بقا کے ازلی دشمن کی حیثیت سے پوری طرح واقف ہوں اور اس کے ناپاک عزائم کو شکست دینے کے لیے ہمہ وقت بیدار رہیں۔'' (۶۴)

نسیم حجازی پہلے منظر میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری کی زبانی ہندو طرزِ سیاست پر طنزیہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں:

''نپولین، ہٹلر اور میسولینی کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بڑی طاقتوں کے جواب میں بھی طاقت استعمال کرتے تھے لیکن مہاتما جی کا بھلا ہو کہ وہ ہمیں کمزور کو دبانے اور طاقتور سے دبنے کا طریقہ سکھا گئے ہیں۔'' (۶۵)

یہی ہندو ذہنیت مول چند نامی ایک ہندو ذخیرہ اندوز کی التجاؤں سے ٹپکتی ہے جو وہ بھارتی صدر اور وزیرِ اعظم سے اس وقت کرتا ہے جب بھارتی شکست کے بعد پاکستانی فوج کے خوف سے لاکھوں ہندوستانی جان بچانے کے لیے دہلی کا رخ کرتے ہیں لیکن حکم ران انہیں پہلے چین اور بعد میں پاکستان کی یلغار سمجھ کر بدحواس ہو جاتے ہیں:

''مول چند: راشٹر پتی جی! پردھان منتری جی! بھگوان کے لیے دہلی کو بچایئے۔ اس وقت پہلے آل انڈیا ریڈیو پر امن اور شانتی کے حق میں تقریریں کیجیے۔ دنیا کو یہ بتایئے کہ پاکستان ہمارا پڑوسی ہے اور ہم اس کی ہر شکایت دور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہندی اور چینی آپس میں بھائی

بھائی ہیں۔ یعنی چین بڑا بھائی ہے اور بھارت چھوٹا بھائی اور چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے چرنوں میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ اس جنگ کی ساری ذمہ داری مغربی ممالک کے سر تھوپ دیجیے۔ انہیں جی بھر کر گالیاں دیجیے۔ ملائشیا کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیجیے۔ انڈونیشیا کے صدر کو تار دیجیے کہ ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ جھگڑے نپٹانے کے لیے ان کی ثالثی قبول کرتے ہیں اور شیخ عبداللہ کو رہا کر دیجیے اور ماسٹر تارا سنگھ کو یہ پیغام بھیجیے کہ ہم صرف مشرقی پنجاب مین ہی نہیں بلکہ پورے بھارت میں پنجابی زبان رائج کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ناگالینڈ کی آزادی کا اعلان کر دیجیے اور اگر کشمیر میں ہماری فوج کا کوئی حصہ بچ گیا ہے تو انہیں حکم دیجیے کہ وہ اپنا گولہ بارود اور وردیاں پھینک کر واپس آجائیں..... شاستری جی جلدی کیجیے۔'' (۶۶)

اس کے بعد وزیرِ اعظم بری فوج کے سربراہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ یہ جنگ جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے اور خیال رکھے کہ بھارت کے سینچورین ٹینک بہت قیمتی ہیں۔ اسی طرح فضائیہ کے سربراہ کو خبردار کرتا ہے کہ ان کے طیارے بے حد قیمتی ہیں، ان میں سے ایک بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے منظر میں وزیرِ اعظم اپنی وزیرِ اطلاعات اندرا گاندھی کو بتاتا ہے کہ جنرل چودھری نے انہیں خوش خبری سنائی ہے کہ وہ کل دوپہر کا کھانا لاہور جمخانہ کلب میں کھانے کا پروگرام بنا چکا ہے۔ اس پر اندرا گاندھی بڑا پر لطف جواب دیتی ہے:

''مہاراج! انہوں نے مجھے بھی یہ خوشخبری سنائی تھی اور میں نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر میں بھارت کی وزیرِ اطلاعات نہ ہوتی تو اپنے ہاتھوں سے اپنے بہادر سپہ سالار کا بھوجن تیار کرتی۔'' (۶۷)

نسیم حجازی کا کہنا ہے کہ ہندو یہ سمجھتا تھا کہ جب وہ حملہ کرے گا تو پاکستان ہاتھ

باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے گا۔ وہ ان کے دل میں چھپے وساوس کی نشان دہی کرتے ہوئے بھارتی وزیرِ دفاع اور ایک بہت بڑے تاجر کے درمیان ہونے والی گفتگو کو یوں پیش کرتے ہیں:

''دھنی رام: مہاراج! اگر پاکستان نے مقابلہ کیا تو ..... مجھے ڈر ہے۔

چون: تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟

دھنی رام: مہاراج! مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر پاکستان نے مقابلہ کیا .....تو سچ مچ جنگ ہو جائے گی۔'' (۶۸)

نسیم حجازی نے ہندوؤں کی توہم پرستی پر بھی چوٹ کی ہے۔ مثال کے طور پانی پت کے ذکر پر بھارتی وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری ہندوؤں کی تاریخی شکست یاد آتی ہے اور وہ اس موقعے پر اس ذکر کو براشگون خیال کرتے ہوئے کہتا ہے:

''چون جی! بھگوان کے لیے آج رات مجھے پانی پت کی یاد نہ دلاؤ۔ میرے سامنے پانی پت کے ان سورماؤں کا ذکر نہ کرو جن کی یاد میں بھارت ماتا دوسو سال سے آنسو بہا رہی ہے۔اگر تم نے چند بار اور پانی پت کا نام لیا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ پانی پت کو بھول جاؤ چون جی۔ وہ بھارت کے سپوتوں کا مرگھٹ ہے۔'' (۶۹)

پورس کے ہاتھی دراصل استعارہ ہے جس کی مدد سے نسیم حجازی اپنے قاری کو بتاتے ہیں کہ جس طرح اسکندرِ اعظم کے سامنے راجا پورس کے ہاتھی نہ صرف ناکام ہوگئے تھے بلکہ اپنی ہی فوج کے لیے بے تحاشا نقصان کا سبب بن گئے تھے، اسی طرح ۱۹۶۵ء کی جارحیت کے موقعے پر ہندوستان کے ٹینک جن پر ہاتھی کا نشان بنا ہوا تھا ، نہ صرف پاکستانی جاں بازوں کا شکار بن گئے تھے بلکہ بدحواسی کے عالم میں اپنی ہی بعض چوکیوں پر گولہ باری کرتے ہوئے واپس بھاگ رہے تھے۔نسیم حجازی نے ہندوؤں کی توہّم پرستی کو مزاح کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس کی

ایک مثال ہندوستانی وزیرِ دفاع مسٹر چون ہے جو بات بات پر ہاتھی اور پورس کے نام سے بدکتا اور خوف زدہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ شاستری اور چون کے درمیان یوں گفتگو ہوتی ہے:

''شاستری: چون جی! جنرل چودھری کہتا ہے کہ ہمارے ٹینک پیش قدمی کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ ہم مختلف محاذوں سے پاکستان کی سرحدوں کو عبور کریں گے۔ رات کے وقت ان کی طاقت ہزاروں ہاتھیوں سے زیادہ ہوگی اور ان کے پیچھے ہزاروں بکتر بند گاڑیاں، جیپیں اور ٹرک ہوں گے۔

چون: (ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے) شاستری جی! بار بار ہاتھیوں کا ذکر نہ کیجیے، یہ بدشگونی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔''

اندرا: چون جی! ٹینک اور ہاتھی کا موازنہ کوئی نئی بات نہیں۔ جب ہم باہر سے ٹینک منگوا رہے تھے تو میرے پتا جی یہ کہا کرتے تھے کہ موجودہ دور کی جنگ میں ٹینک کی وہی اہمیت ہے جو پرانی جنگوں میں ہاتھی کی ہوا کرتی تھی۔ آپ صرف اس لیے پریشان ہیں کہ ہاتھیوں کا ذکر سن کر آپ کو راجہ پورس کے وہ ہاتھی یاد آجاتے ہیں جنہوں نے میدان سے منہ پھیر کر بھاگتے ہوئے راجہ کی اپنی ہی فوج روند ڈالی تھی۔'' (۷۰)

یہی ایک نہیں بلکہ ہر بڑا ہندو لیڈر اپنی بزدلانہ تاریخ سے واقف ہونے کی وجہ سے ان تاریخی واقعات کے ذکر سے گھبراتا ہے۔

نسیم حجازی نے ہندوؤں کے احساسِ کم تری اور مسلمانوں کے مقابلے میں نفسیاتی الجھنوں کو بھارتی وزیرِ اعظم شاستری کے اپنے سیکریٹری کے ساتھ ان سوالات و جوابات کی مدد سے پیش کیا ہے جن میں وہ خود کو نپولین، ہٹلر اور ونسٹن چرچل کہلواتا ہے اور اپنے ٹھگنے قد کو ہمالہ کے برابر قرار دلواتا ہے۔ البتہ جنگ کے اختتام پر انہی سوالات کے جو جوابات سننے کو ملتے ہیں وہ تحریر کو مزاح کا اعلیٰ نمونہ بنا دیتے ہیں:

''شاستری: کیا میرا قد ہمالہ سے بڑا ہے؟
سیکریٹری: نہیں مہاراج۔
شاستری: کیا میں نپولین ہوں؟
سیکریٹری: نہیں مہاراج۔
شاستری: کیا میں ہٹلر ہوں؟
سیکریٹری: بالکل نہیں مہاراج۔
شاستری: کیا میں ونسٹن چرچل ہوں؟
سیکریٹری: ہرگز نہیں مہاراج۔
شاستری: تو پھر میں کیا ہوں؟.....
سیکریٹری: مہاراج آپ ..... معاف کیجیے میں صرف آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ آپ .....راجہ پورس ہیں مہاراج۔'' (۱۷)

دراصل شاستری اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے نفسیاتی الجھن کا شکار ہے اور پاکستان کو فتح کر کے خود کو سیاسی طور پر قد آور بنانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دل میں ہندوؤں کی تاریخی شکستوں کا خوف بھی ہے جس کی وجہ سے وہ پانی پت اور راجہ پورس کے الفاظ سے گھبراتا ہے۔اس کی یہ نفسیاتی الجھنیں بار بار صورتِ حال کو خندہ ریز بناتی ہیں۔

وقفے وقفے سے جنرل چودھری کے مضحکہ خیز اقدامات کہانی کو زیب و زینت دے رہے ہیں۔ وہ بلند بانگ دعووں کے بعد ٹیلی فون پر شاستری کو ''بڑی خوش خبری'' دیتا ہے کہ ان کے بہت سے ٹینک حملے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔تھوڑی دیر بعد بتاتا ہے کہ وہ پاکستان کے اندر گھس گئے ہیں اور راستہ بالکل صاف ہے۔ اس پر شاستری ، چون ، نندہ اور اندرا گاندھی ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔ پھر فتح کے جشن کا لمبا چوڑا پروگرام بناتے ہیں۔اتنے میں ایک کرنل ، جنرل چودھری کی طرف سے شاستری کے نام شام پونے

پانچ بجے لاہور جمخانہ کلب میں چائے کا دعوت نامہ لے کر داخل ہوتا ہے جو حملے کا فیصلہ ہوتے ہی چھپوا لیا گیا تھا۔اندرا گاندھی کے سوالات کے جواب میں وہ اس جنگ کو ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ اور اپنا نام پرس رام بتاتا ہے جس پر مسٹر چون پھر تلملا اٹھتا ہے۔ اسی طرح جب بھارت کے ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کے بے تحاشا نقصانات کی خبریں آتی ہیں اور حکومتی عہدے دار ایک دوسرے کو کوستے ہیں تو وزیرِ خزانہ دیوانگی کے عالم میں ہاتھیوں کا ذکر کر بیٹھتا ہے۔ اس وقت کی صورتِ حال یوں نظر آتی ہے:

''کرشنم اچاری: مہاراج! میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کی فوجیں جو گولے ہمارے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں پر برساتی ہیں وہ میرے سینے پر لگتے ہیں۔ پرسوں رات میں نے سپنا دیکھا تھا کہ میں ہوائی اڈہ بن گیا ہوں اور دشمن کے لڑاکا طیارے مجھ پر گولیاں برسا رہے ہیں۔کل میں نے یہ سپنا دیکھا تھا کہ میں ایک ٹینک ہوں اور اپنی مرضی کے خلاف بھاگتا ہوا دشمن کی توپوں کی زد میں آ گیا ہوں..... پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ہاتھی بن گیا ہوں۔

چون: (بدحواس ہو کر) ہاتھی؟'' (۷۲)

جنگ کے دوران میں بھارتی فوج اور ایئر فورس کی حواس باختگی کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس موقعے پر بھارتی نقصانات کے متعلق حکومتی عہدے داروں کے درمیان یوں گفتگو ہوتی ہے:

''شاستری: کیا پاکستان ریڈیو کی یہ اطلاع درست ہے کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں ہمارے سات ہوائی جہاز تباہ ہوئے ہیں؟

ارجن سنگھ: مہاراج! سرکاری طور پر ہم نے صرف اپنے ایک ہوائی جہاز کا نقصان تسلیم کیا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمارے آٹھ ہوائی جہاز تباہ

ہوئے ہیں۔

شاستری: وہ کیسے؟

ارجن سنگھ: وہ یوں کہ ہمارے ایک ہوا باز نے بھارت کے امرتسر کو پاکستان کا لاہور یا گوجرانوالہ سمجھ کر بم باری شروع کردی تھی۔

چون: آپ کا مطلب ہے کہ جس طرح ہمارے ایک ٹینک نے ہمارے دوسرے ٹینک کو تباہ کردیا تھا، اسی طرح ہمارا ایک ہوائی جہاز بھی امرتسر کے ہوائی اڈے پر بم برسا کر ہمارے دوسرے ہوائی جہاز کو نشانہ بنا چکا ہے؟

ارجن سنگھ: نہیں مہاراج! یہ ہماری خوش قسمتی تھی اس ہوائی جہاز کا کوئی نشانہ ٹھیک نہیں لگا۔ اس کے سارے بم ہوائی اڈے سے دو ہزار گز دور ایک کھیت میں گے تھے۔

شاستری: پھر کیا ہوا؟

ارجن سنگھ: پھر کیا ہونا تھا مہاراج! جب اوپر سے اچانک بم باری شروع ہوئی تو نیچے سے امرتسر کے ہوائی اڈے کی طیارہ شکن توپیں حرکت میں آ گئیں اور وہ گر پڑا اور گرا بھی اس طرح کہ ہماری ایک توپ، ایک پٹرول کی گاڑی اور پندرہ آدمی جن مین آٹھ سویلین اور پانچ فوجی تھے اس کی زد میں آ گئے۔'' (۷۳)

جنگ ہارنے کی وجوہ گنتے ہوئے بری فوج کے سربراہ اور وزیرِ دفاع کی گفتگو بھی مزاح کا سبب بنتی ہے:

''جنرل چودھری: اگر آپ میری بجائے میری فوج کے افسروں اور سپاہیوں سے اس ناکامی کی وجہ پوچھ لیتے تو آپ کو میرا وقت ضائع کرنے

کی ضرورت پیش نہ آتی۔

چون: اور آپ کے افسر اور سپاہی کیا کہتے ہیں؟

جنرل چودھری: مہاراج! وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ جنگ خالص اصولوں کے تحت لڑی ہے اور پاکستانی اتنے بے ڈھب ہیں کہ انہوں نے کسی محاذ پر بھی ان اصولوں کی پروانہیں کی۔'' (۷۴)

پھر وہ ان اصولوں کو بیان کرتا ہے:

''پہلا اصول یہ ہے کہ اگر مقابلہ کرنے والے کی پوزیشن کمزور ہو تو وہ ہمیشہ پسپا ہوکر یا ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے..... لیکن پاکستان کی فوج نے ہر محاذ پر اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کی پوزیشن جس قدر کمزور ہوتی ہے ، اسی قدر وہ جم کر لڑتی ہے۔''(۷۵)

جنگ کے بعد کی اسی میٹنگ کے دوران میں وزیرِ داخلہ گلزاری لال نندہ کا یہ سوال بھی طنز کی اچھی مثال ہے:

''جنرل صاحب! مجھے یہ بتایئے کہ ہمارے سپاہیوں کو شراب کے نشے میں بھی یہ کیسے یاد رہتا ہے کہ ان کے لیے آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنا بہتر ہے؟'' (۷۶)

جنگ کے بعد بھارتی حکم ران جنگی نقصانات کو پورا کرنے کے لیے جو تجاویز پیش کرتے ہیں وہ بھی مضحکہ خیز ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ زیادہ اناج اگا کر زرِ مبادلہ کمایا جائے اور دوسرا کہتا ہے کہ زیادہ اناج اگانا مشکل ہے لہٰذا لوگوں کو دو کی بجائے ایک وقت روٹی کھانے کی تلقین کی جائے۔ اس طرح لاکھوں ٹن اناج بچایا جاسکتا ہے۔ یوں نسیم حجازی نے ہندوستانیوں کی بھوک کا مذاق اڑایا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بھارتی وزیرِ خزانہ کی فکر مندی کا اظہار اس انداز

میں کرتے ہیں:

''کرشنم اچاری: کوئی عقل کی بات کیجیے چون جی! ہم خوش قسمت ہیں کہ یہ جنگ سترہ دن سے آگے نہیں بڑھی ورنہ آپ کو ملک بھر میں ہائے روٹی ، ہائے دھوتی کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی۔'' (۷۷)

نسیم حجازی اس موقعے پر بھی کامیاب مزاح نگار دکھائی دیتے ہیں جب بھارتی سیاست دان کشمیر میں فسادات کی آگ بھڑکا کر مسلمانوں کی نسل کُشی کا منصوبہ بناتے ہیں۔وہ ہندو غنڈوں کی سفاکی اور بزدلی کا استہزاء کرتے ہوئے ان کے وزیرِ داخلہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''نندہ: میں جن سنگھ ،سیوک سنگھ اور مہا سبھا کے جوانوں کے متعلق آپ سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ اگر انہیں اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ ہماری پولیس اور فوج کسی صورت میں بھی مسلح باغیوں سے ان کا تصادم نہیں ہونے دے گی اور ان سے صرف نہتے کشمیریوں کے سینوں میں چھرے گھونپنے یا ان کی بستیاں جلانے کا کام لیا جائے گا تو وہ شیروں کی طرح گرجتے ہوئے کشمیر کا رخ کریں گے لیکن جب آپ ان میں چھروں کی بجائے رائفلیں اور پستول تقسیم کریں گے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ انہیں کسی فوجی مہم پر بھیجا جا رہا ہے اور ان کا جی کھٹا ہو جائے گا۔ اس لیے پستول اور بندوق وغیرہ کا تو ان کے سامنے نام ہی نہ لیجیے ورنہ اندرا دیوی لاکھ سر کھپائیں وہ کشمیر نہیں جائیں گے۔ ہاں کچھ عرصہ بعد اگر رکھشا منتری جی آل انڈیا ریڈیو پر یہ اعلان کرنے کے قابل ہو جائیں کہ بھارت کی بری اور فضائی افواج نے باغیوں یعنی بندوقوں کے مقابلہ میں بندوقیں چلانے والے باغیوں کو کچل دیا ہے اور کشمیر میں جو مسلمان زندہ رہ گئے ہیں وہ بھارت کی اقلیتوں سے زیادہ بے بس ہیں تو ہمارے یہی جوان چھرے

پھینک کر بندوقیں اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔'' (۷۸)

نسیم حجازی نے مستقبل کے بھارتی منصوبوں اور پاکستان پر ایٹمی حملے کے مضحکہ خیز مشوروں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ بعد ازاں وہ شاستری کے چھوٹے قد کا کا دل کھول کر مذاق اڑاتے اور مختلف سیاست دانوں کی زبان سے شاستری پر کڑی طنز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیرِ خزانہ کی گفتگو یوں پیش کرتے ہیں:

''کرشنم اچاری: اگر آپ پچھلی جنگ میں پاکستان فتح کر لیتے تو بھارت کے عوام فخر سے آپ کو ننکو کہتے ..... اور اس دن بھارت میں جو بچے پیدا ہوتے ان میں سے اکثر کا نام ننکو رکھا جاتا اور ہم خوشی سے لاہور جانے والی سڑک کا نام ننکو روڈ یا دہلی کے چاندنی چوک کا نام ننکو چوک رکھتے ..... مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کے ہاتھوں پاکستان کا وہی حشر ہوتا جو ہٹلر کے ہاتھوں یورپ یا پنڈت نہرو کے ہاتھوں حیدر آباد کا ہوا تھا یعنی حملہ کرتے ہی مختلف محاذوں پر بھارتی سینا کی پٹائی نہ شروع ہو جاتی تو یہ نام یعنی ننکو بھارت کے ہر بچے اور بوڑھے کی زبان پر ہوتا۔ بھارت کے دوکاندار (۷۹)

اشتہار بازی کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے اور ہم ہر شہر میں ننکو سوڈا واٹر، ننکو حلوا، ننکو ہیئر آئل، ننکو خضاب، ننکو سوپ، ننکو کریم، ننکو بلیڈ اور ننکو اِنک وغیرہ کے سائن بورڈ دیکھتے۔ بھارت کے شاعر ننکو پر نظمیں لکھتے اور بھارت کی فلم کمپنیاں ننکو بہادر، ننکو پہلوان یا ننکو شیر کے نام سے فلمیں تیار کرتیں اور آپ گھر بیٹھے ان سب سے اپنا قیمتی نام استعمال کرنے کا معاوضہ وصول کرتے۔ آنے والی نسلیں آپ کو ننکو بابا یا ننکو دی گریٹ کے نام سے یاد کرتیں۔ اس لیے آپ کو اس نام سے چڑنا نہیں چاہیے بلکہ

خوش ہونا چاہیے۔'' (۸۰)

شاستری یوں تو چھوٹے قد کی وجہ سے رکھے گئے اپنے الٹے نام ننکو سے بہت چڑتا ہے لیکن جنگ کے اختتام پر جب وزیرِ داخلہ اسے بھارت کا پردھان منتری ہونے کے ناتے سے جنگی نقصانات کا سب سے بڑا ذمہ دار قرار دیتا اور بھوکے ننگے عوام کی طرف سے اسے پھانسی کا خوف دلاتا ہے تو وہ اسی چڑ کو اپنی پناہ گاہ بنا لیتا ہے۔ یہ صورتِ حال بہت مزاحیہ ہے:

''نندہ: لیکن مہاراج! آپ عام انسان نہیں ہیں ۔ آپ بھارت کے پردھان منتری ہیں۔ آپ ہٹلر، نپولین اور ونسٹن چرچل ہیں۔

شاستری: نندہ جی! تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ جب لوگ مجھے پرلوک کا راستہ دکھائیں گے تو میں ننکو بن جاؤں گا۔ میں ان سے یہ کہوں گا کہ بھارت کی تباہی کا ذمہ دار تمہارا ننکو نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمہارے ننکو کو ہٹلر اور نپولین بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ (۸۱)

نسیم حجازی نے لفظی تکرار و ہیر پھیر، ہندوؤں کی توہم پرستی اور مذہبی عقاید کو قہقہوں کی تخلیق کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس حوالے سے 'پورس کے ہاتھی' ان کی کامیاب تصنیف ہے۔

نسیم حجازی کی مزاحیہ تصانیف پر اعتراضات

نسیم حجازی کی تحریروں میں بھی بعض فنی نقائص موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب ''سو سال بعد'' میں موضوعاتی وحدت مفقود ہے۔ بائیس عنوانات میں سے ہر ایک کی الگ کہانی ہے اور قاری کو شعوری طور پر اصل موضوع کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ نسیم حجازی کا مزاح مقصدیت زدہ ہے۔ کہیں کہیں قہقہوں کے درمیاں اچانک دھیما پن آ جاتا ہے اور تحریر سنجیدگی کی حدود کو چھونے لگتی ہے۔ اس کے متعلق شگفتہ الطاف کی رائے ہے:

''جب نسیم حجازی مزاح یا طنز لکھتے ہیں تو بھی ان کا قلم حقائق کی سنجیدگی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس بنا پر بعض اوقات تمثیل اپنے آخری

درجے تک جا پہنچتی ہے اور حقائق غالب آجاتے ہیں۔'' (۸۲)

یہ بات درست ہے کہ فن کے اعتبار سے نسیم حجازی کی مقصدیت ان کی مزاح نویسی کو کسی قدر گہنا دیتی ہے لیکن جب ہم یہ حقیقت مان لیتے ہیں کہ وہ ایک نظریاتی مصنف ہے تو پھر یہ امر اعتراض کی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔

نسیم حجازی کہیں تاریخی ناول نگاری کے انداز میں پلاٹ کو بے جا طویل بنا دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال 'سفید جزیرہ' کے پلاٹ کی ہے۔ پچھلے ابواب میں وزارتوں کی کثرتِ تعداد پر بھرپور نشتر زنی کے بعد نیا باب ''وزارتیں اور وزارتیں'' بڑی حد تک غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ شگفتہ الطاف اس باب کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''نسیم حجازی یہاں پلاٹ کے تانے بانے میں بعض اوقات طوالت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ضمنی واقعات کو اس قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ پلاٹ ایک سیدھی کہانی سے ادھر ادھر بھٹکنے لگتا ہے۔ ساتھ ساتھ مکالموں کی طوالت حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔'' (۸۳)

نسیم حجازی کی ادبی دانش نے بعض مقامات پر سیاسی ٹھوکر کھاتے ہوئے مستقبل کے متعلق غلط اندازے لگائے ہیں جس کی ایک

مثال سفید جزیرہ کا یہ اختتامی پیراگراف ہے:

> ''کنگ سائمن کی پرواز کے بعد سفید جزیرے کی تاریخ سے اس سوال کا مفصل جواب نہیں ملتا کہ اس کے جرائم پیشہ وزیروں پر کیا گزری۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ نئی حکومت نے کسی دقت کا سامنا کیے بغیر اپنی اولین فرصت میں ان کی تجوریوں کی تلاشی لے چکی تھی اور سرکاری خزانے میں سونے اور چاندی کے انبار لگ چکے تھے۔ اس کے بعد سفید جزیرے کی تاریخ میں نئے نئے تعمیری اور اصلاحی منصوبوں کا ذکر آتا ہے لیکن

بددیانت وزیروں او رافسروں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ لوگ صرف کنگ سائمن ڈے پر انہیں یاد کرتے ہیں۔'' (۸۴)

یہ بات حقیقت سے زیادہ نسیم حجازی کا وہ خواب ہے جس کی تعبیر بالکل الٹ سامنے آئی ہے۔ بدقسمتی سے آج تک نہ ان قومی لٹیروں کا احتساب کیا گیا ہے، نہ قومی دولت خزانے میں لوٹائی گئی ہے اور نہ قوم کو بددیانت افسر شاہی اور کرپٹ سیاست دانوں سے نجات ملی ہے۔ البتہ اب ۲۰۰۹ء کے آخر میں سپریم کورٹ کے سرگرم فیصلوں نے عوام میں امید کی نئی کرن پیدا کی ہے۔

نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کی طرح ان کی مزاحیہ تصانیف میں بھی مکالموں کی طوالت اور خطیبانہ انداز برقرار ہے۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے شگفتہ الطاف لکھتی ہیں:

''کبھی کبھی مکالموں کی طوالت پلاٹ کو متاثر کرتی ہے۔'' (۸۵)

اس میں شک نہیں کہ مکالموں کی اس طوالت سے شگفتہ تحریر کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے نسیم حجازی کسی ناسور کی کامیاب جراحی کے بعد اس انتظار میں بیٹھ گئے ہیں کہ زخم ٹھیک ہو تو آگے بڑھیں لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ نسیم حجازی کی مزاح نگاری محض چہلِ طبع کے لیے نہیں ہے۔ وہ ہر انسان کے لیے گدگدی کا ایک جیسا احساس نہیں رکھتی بلکہ مصنف یہاں بھی خیر و شر کے معرکوں کو موضوع بنائے ہوئے ہے۔ اس کی یہ تحریریں بھی مقصدیت کی علم بردار ہیں۔ اس ضمن میں شگفتہ الطاف رقم طراز ہیں:

''ان کی مزاحیہ تحریریں بھی اس ایک مقصد کے گرد گھومتی ہیں اور ان کی کتاب خواہ ''سو سال بعد'' ہو یا ''پورس کے ہاتھی'' درحقیقت مسلمانوں کو ہندو ذہنیت سے آگاہ کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے والے ذہن کے لیے نسیم حجازی کا پیغام کارگر بھی ہے۔'' (۸۶)

نسیم حجازی ایک نظریاتی ادیب ہیں۔ ان کی مزاحیہ تصانیف اپنے اندر وہ سیاسی اور تہذیبی شعور لیے ہوئے ہیں جس سے ایک طرف محبِ وطن و اسلام طبقہ طمانیت و تقویت حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف مخالف نظریات کے حامی انگاروں پر لوٹتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر پاکستانی ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے جب کہ ہندو مذہب و سیاست کے حاشیہ برداروں کو طنز کے یہ نشتر نا قابلِ برداشت محسوس ہوتے ہیں۔

کسی بھی فن پارے کی حقیقی کام یابی یہ ہوتی ہے کہ اس کا تخلیق کار اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں کس حد تک کام یاب رہا ہے اور درج بالا مباحث سے ثابت ہوتا ہے کہ نسیم حجازی کی تمام مزاحیہ کتب اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ وہ طنز و مزاح نگاری میں صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ ان کے ہاں طنز و مزاح کے حوالے سے پختہ سوچ اور اعلیٰ ذوق کی فراوانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر کے کسی بھی بڑے مزاح نگار کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) نسیم حجازی، پاکستان سے دیارِ حرم تک، ص ۸، جہانگیر بک ڈپو لاہور، ۲۰۰۵ء

(۲) نسیم حجازی، ۱۹۴۷ء کی کرپان اور ۱۹۷۰ء تلوار (مضمون) مشمولہ نسیم حجازی.....ایک مطالعہ؛ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۳۱۹

(۳) نسیم حجازی، بادشاہت اور آمریت کے قیام کی حیرت انگیز کہانی (مضمون) مشمولہ نسیم حجازی.....ایک مطالعہ؛ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۴۰۷

(۴) ایضاً، ص ۴۰۸

(۵) جیسا کہ متن میں ہے

(۶) شہرین فاروقی، کوہستان کا تاریخی و تنقیدی جائزہ، ص ۹۸۔۹۹، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۷۴ء

(۷) ایضاً، ص ۹۹۔۱۰۰

(۸) نسیم حجازی، آخری چٹان، ص ۵۵، جہانگیر بک ڈپو لاہور، ۲۰۰۵ء

(۹) نسیم حجازی، شاہین، ص ۱۵۲، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۵ء

(۱۰) نسیم حجازی، خاک اور خون، ص ۱۲۳، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۵ء

(۱۱) ایضاً، ص ۹۰۔۹۱

(۱۲) نسیم حجازی، پردیسی درخت، ص ۲۸۲، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۵ء

(۱۳) ایضاً، ص ۱۲۵۔۱۲۶

(۱۴) ایضاً، ص ۱۳۷

(۱۵) نسیم حجازی، پردیسی درخت، ص ۳۰۱

(۱۶) ایضاً، ص۴۰

(۱۷) ایضاً، ص۱۰۷

(۱۸) نسیم حجازی، گمشدہ قافلے، ص۱۰۳ ، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۵ء

(۱۹) نسیم حجازی، پردیسی درخت، ص۳۸۳

(۲۰) نسیم حجازی، سو سال بعد، ص۱۲، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۵ء

(۲۱) ایضاً، ص۱۷

(۲۲) ایضاً،ص۱۸

(۲۳) ایضاً،ص۲۸

(۲۴) ایضاً،ص۴۴

(۲۵) ایضاً،ص۴۸

(۲۶) ایضاً،ص۶۱

(۲۷) ایضاً،ص۶۷

(۲۸) ایضاً،ص۶۸

(۲۹) ایضاً،ص۹۹

(۳۰) ایضاً،ص۱۳۹

(۳۱) ایضاً،ص۱۴۰_۱۴۱

(۳۲) ایضاً،ص۱۴۲_۱۴۳

(۳۳) نسیم حجازی،سفید جزیرہ،ص۱۹، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۵ء

(۳۴) ایضاً،ص۱۹

(۳۵) ایضاً،ص۲۳،۲۴

(۳۶) ایضاً،ص ۲۸

(۳۷) ایضاً، ص ۵۶

(۳۸) ایضاً، ص ۵۹

(۳۹) ایضاً، ص ۷۳

(۴۰) ایضاً، ص ۱۳۴۔۱۳۵

(۴۱) ایضاً، ص ۷۳

(۴۲) ایضاً، ص ۹۱

(۴۳) ایضاً، ص ۱۶۸۔۱۶۹

(۴۴) شگفتہ الطاف، نسیم حجازی بحیثیت مزاح نگار، ص ۱۵۹

(۴۵) نسیم حجازی، سفید جزیرہ، ص ۱۶۱۔۱۶۲

(۴۶) ایضاً، ص ۲۳۴۔۲۳۵

(۴۷) ایضاً، ص ۲۱۳

(۴۸) ایضاً، ص ۲۱۵

(۴۹) ایضاً، ص ۲۳۵

(۵۰) شگفتہ الطاف، نسیم حجازی بحیثیت مزاح نگار، ص ۱۷۷

(۵۱) نسیم حجازی، ثقافت کی تلاش، ص ۴، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء

(۵۲) ایضاً، فلیپ، قومی کتب خانہ، ۱۹۔ فیروز پور روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء

(۵۳) نسیم حجازی، ثقافت کی تلاش، ص ۸

(۵۴) ایضاً، ص ۲۵

(۵۵) ایضاً، ص ۳۴

(۵۶) ایضاً، ص ۵۷

(۵۷) ایضاً، ص ۶۶۔۶۷

(۵۸) ایضاً،ص ۶۹

(۵۹) ایضاً،ص ۹۸

(۶۰) ایضاً،ص ۱۲۴

(۶۱) شگفتہ الطاف،نسیم حجازی بحیثیت مزاح نگار،ص ۱۹۵

(۶۲) ایضاً،ص ۲۰۶

(۶۳) ایضاً،ص ۱۸۶

(۶۴) نسیم حجازی، پورس کے ہاتھی،ص ۷، جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء

(۶۵) ایضاً،ص ۱۴

(۶۶) ایضاً،ص ۱۱۲_۱۱۳

(۶۷) ایضاً،ص ۲۹_۳۰

(۶۸) ایضاً،ص ۳۴

(۶۹) ایضاً،ص ۳۹

(۷۰) ایضاً،ص ۴۲

(۷۱) ایضاً،ص ۱۹۱

(۷۲) ایضاً،ص ۶۹

(۷۳) ایضاً،ص ۹۲_۹۳

(۷۴) ایضاً،ص ۷۴

(۷۵) ایضاً،ص ۷۵

(۷۶) ایضاً،ص ۱۴۳

(۷۷) ایضاً،ص ۱۴۳

(۷۸) ایضاً،ص ۱۵۷

(۷۹) جیسا کہ متن میں ہے

(۸۰) نسیم حجازی، پورس کے ہاتھی، ص۱۶۹۔۱۷۰

(۸۱) ایضاً، ص ۱۷۶

(۸۲) شگفتہ الطاف، نسیم حجازی بحیثیت مزاح نگار، ص ۱۱۶

(۸۳) ایضاً، ص۱۶۳

(۸۴) نسیم حجازی، سفید جزیرہ، ص ۲۹۶

(۸۵) شگفتہ الطاف، نسیم حجازی بحیثیت مزاح نگار، ص ۱۲۸

(۸۶) ایضاً، ص۲۳۲۔۲۳۳